نظام کالج میگزین

بابتہ ماہ دسمبر ابتی سنہ ۵۲۸ء

طلبائے نظام کالج کا سہ ماہی رسالہ

معین دکن پریس

آغا حیدر حسن صاحب ۔ مُدیر پروفیسر نظام کالج

میر عزیز اللہ صاحب ۔ مُعتمد

سید محمد کرمانی صاحب ۔ مُنتظِم

میر سُلطان علی صاحب

سید مسعود احمد رضوی صاحب

محمد عثمان صاحب ۔

جلد ۲ فہرست نظام کالج اردو میگزین نمبر ۱ و ۲

مردہ بدست زندہ

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب معتمد عدالت العالیہ)

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیئے ہیں۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے
نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ
جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا
گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ
جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ۔ جیتے جی تو دوستی و محبت
کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ پوچھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا
بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے۔ آجکل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ دیکھئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔
سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔
بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی
سواریوں میں بیٹھے ہیں۔ یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام

کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں میں ملکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ کیا مر گئے؟ ہمارے تو بڑے دوست تھے۔!! اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے۔ تعریف ختم ہو چکی۔ اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھیڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کے سامنے کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ۔ پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے ان ساتھ والوں میں تقسیم شروع ہوئی۔ اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا۔ انہوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنہیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے۔ یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لئے اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا۔ اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرضمندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا۔ جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آگئے۔ اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے۔ اور اب بھی پڑھینگے۔ دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو۔ کپڑے بدل خاص اسی نماز جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم

ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے۔ اور نہ اب پڑھینگے۔ دُور سے مسجد کو دیکھا۔ اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہونچا بھی نہ تھا اُن کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مِلگئی۔ یہ وہیں کھڑے ہوگئے اور سگریٹ پی کر پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اِس بات کا انتظام تھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً ملجائے۔ اِدھر نماز ختم ہوئی اور اُدھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اُدھر سے جنازہ نکلا۔ اِدھر یہ پہونچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سُنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آتے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا۔ اور واپس ہوگئے۔ گویا مونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات انہیں کے تفویض کردیا ہے۔ اور یہ صرف اِس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کردیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہیں کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا اِن کو زہر معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مرکر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ تیڑھا ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے۔ اِسی رفتار سے نکلیگی۔ اور ضرور نکلیگی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئیگی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مُصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے۔ کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنادیا ہے۔ قبرستان کیا ہے؟ خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی ہے۔

اس میں ایک سقّے صاحب اُن کی بیوی۔ دس بارہ بچے۔ پانچ چھے بکریاں۔ ایک لنگڑا ٹٹو۔
سو دو سو مرغیاں۔ پانچ چھے بلّیاں۔ اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصّہ
میں قبریں ہیں وہاں کی گھاس بڑھکر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواریں توڑکر لوگوں نے راستہ بنا لئے
ہیں۔ نیم پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ نکل آئے ہیں
کوئی قبر دھنس کر کنواں بنگئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غایب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی
میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصّہ کی عجب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصّہ جس
میں قبریں نہیں ہیں۔ وہ کسی قدر صاف ہے۔ اور کیوں نہ ہو پہلے حصّہ کا مُردوں سے تعلق ہے
اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبروں کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ اُن کے
جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھہ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپیہ
کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کو صاف رکھا جانا اصول تجارت
پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دوکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھہ کر رکھتا
ہے۔ تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپیہ گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے
وقت اچھا مال دیکھ لو۔ پھر تم جانو اور تمہارے مُردے

میاں سقّہ رہتے تو قبرستان میں ہیں۔ مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اِدھر
لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے۔ اِدھر ان کے بچے سب سب کے سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول
بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لیجا کر پھر قبر پر چڑھا دئے۔ خیر کیا ہرج ہے۔ زندوں کا کام
بھی نکل گیا۔ مُردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں سل بٹا کبھی خریدنے کی نوبت نہیں آتی۔ قبر
کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالح پیس لیا ہے۔ اگر کچھہ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ
جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کبھی قبروں کو
کرید رہی ہیں۔ بچے یا تو جھونپڑی پر لوٹ مار رہے ہیں۔ یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔
بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے

اس پر بھی سقے نے گیہوں سکھانے ڈالے ہیں۔ ٹٹوانی کی ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر،
چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر کودنے سے کسی
قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چونا گرا۔ کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دئے جائیں
تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا۔ فوج میں ترم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ
جھونپڑی میں گھسا۔ اور اناج لینے کو برتن لئے۔ لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے
کا تام چینی کا کٹورہ ہے۔ تو کسی کے پاس ٹوٹی ہوئی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ
میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہونچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے۔ جنازہ لاکر لب
گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین
سخت ہونیکی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔
کوئی قبرستان والے کو برا بھلا کہتا ہے۔ جب اس سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی
ایک ایک قبر پہ جا بیٹھے۔ چبوترے کو تخت بنایا۔ تعویذ کو گاؤ تکیہ۔ اور لگے سگرٹ اور بیڑی کا
دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔
حقے مزے لے لے کر پئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جاتی ہے۔ سلفہ پر سلفہ
بھروایا جاتا ہے۔ اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی
یاد ہی کریں۔ یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض صاحب ہیں کہ گھاس سے بچ بچ قبروں کو کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔
یہ کون ہیں یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو
خدانخواستہ فاتحہ کے لئے کیوں آنے لگے۔ آج شرما شرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت کرم
داشتن کی بدولت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست

مریگا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ اور بجائے فاتحہ پڑھنے کے داد سخن گوئی دیگئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا۔ کچھ ان کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوترے پر متمکن ہیں۔ ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے۔ اور ہر قبر کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی قبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ دعوے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا تو وہ جو ہونا چاہئے۔ اور جس کی غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا آٹھ دس نے غل مچایا "سنبھال کے۔ میت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے۔ آہستہ سے۔" اب میت قبر کے منہ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا۔ ادھر قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے "جانے دو پاؤں کی طرف سے جانے دو۔" کوئی کہتا ہے "ذرا کمر کی چادر کو کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پا کھانہ گرے۔ ہاں، ہاں ذرا اور جھکا کر۔ لاالہ الا اللہ، میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے۔ آہستہ۔ آہستہ۔ بس بھئی بس۔ کوئی چیخ رہا ہے "مٹھے کے بند بن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا۔ بس

بھئی بس۔"

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں بہرحال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہونچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آئی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوئی ہے۔ کوئی کہتا ہے "یہ کڑی نہیں۔ وہ کڑی لو" کوئی کہتا ہے "لاحول ولاقوت۔ مفت میں سو روپیہ مارلئے۔ اور کڑیاں دیں تو ایسی۔" غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے۔ اور مٹی دینے کی نوبت آئی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے۔ لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ "منھا" بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے۔ اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دئے جاتے ہیں جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ملتے ہیں مگر شاید سو میں کوئی بھی نہ ہونگے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں۔ اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے۔ مگر یہاں اگر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ "میت بہت بھاری تھی"۔ کبھی کہتے ہیں کہ "فاصلہ بہت تھا"۔ کبھی کہتے ہیں کہ "آپکی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا"۔ بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی نیت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں۔ اب سوائے اس کے کیا ہے کہ خدا سے دعا کی جائے کہ ان اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ فقط

غزل

(از حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی)

جی بھر کے ابھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا — تم نے اُسے اے موسیٰ عمراں نہیں دیکھا

واعظ نے درِ کعبۂ عشاق نہیں دیکھا — عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا — ویراں سے دیکھا ابھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل تا لبِ خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ — گردوں کو حریف خمِ چوگاں نہیں دیکھا

پھر رکنے سکیں کی جوانی کی امنگیں — رہرو کو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمین گاہ سے واقف ہے بھلا کون — کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

پہنچا وہی منزل پہ نئی جس کو رہِ راست — اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اُسے آسان ہی پایا — مشکل جسے سمجھا اُسے آساں نہیں دیکھا

دم لیکے ذرا راہ میں جب تک میں اُٹھوں — کوسوں تجھے اے عمرِ گریزاں نہیں دیکھا

ہے گلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی — نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کیلئے برق کی جا ہے سفرِ برق جز ابر بہ اور شبستاں نہیں دیکھا
جو حال گلستاں کا ہے جھونکوں سے خزاں کے طاؤس کو اس طرح پرافشاں نہیں دیکھا
بے سایۂ فگن رتبہ پہ گرد قدم اپنی۔ پھرتے ہوئے یوں چترِ سلیماں نہیں دیکھا
وحشت میں بھی پابندر ہا وضع کا اپنی کوچہ کوئی جز چاکِ گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظمِ اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی برزدہ داماں نہیں دیکھا

وقارِ سخن

حضرت وقار لکھنوی

کعبہ میں بھی بچے نہ خیالِ بتاں سے ہم پہونچے اُسی جگہ پہ چلے تھے جہاں سے ہم
ہمت نے پست ہوکے کہا مرشو یہیں۔ منزل پہ آگئے جو چھٹے کارواں سے ہم
لیجانے والے سوئے قفس دم تو لے ذرا کچھ پھول چنکے لیتے چلیں بوستاں سے ہم
پلٹا تو آگ بنکے چلا آبِ شورِ اشک شعلہ اٹھا کہ جلگئے ضبطِ فغاں سے ہم
پھیری جو اُسنے آنکھ بگڑ کر تو بن پڑی بچکر نکلگئے نگہِ پاسباں سے ہم
اے رعبِ حسن تو ہی کچھ انصاف سے بتا کیا دلمیں ہے بیان کریں کیا زباں سے ہم
ہر داغِ دل تھا قابلِ نذرِ جمالِ دوست لائے تھا اس بہار کو رنگِ خزاں سے ہم

اشعار کہکے اُکھ سنا آئے اے وقار
جو کہہ سکے نہ نثر میں اپنی زباں سے ہم

اسلام یورپ کی نظر میں

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجیب حیرت انگیز، مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے۔

"عیسائیت۔ اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی۔ اور نہ سمجھ سکی۔ وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی۔ لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں اس طرح منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے[1]۔"

یہ اور اس قسم کے خیالات مدت تک قائم رہے۔ سترھویں صدی کے سنین وسطی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے۔ یورپ کی جدوجہد، سعی و کوشش، اور حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے مقصد کی چیز جو اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے۔ جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں۔ عربی زبان کے مدارس علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے اور اسطرح وہ زمانہ قریب آگیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

غرضیکہ مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند، اٹھارویں صدی کے اواخر سے لیکر انیسویں صدی کے اختتام

---

[1] محمد اینڈ محمڈنزم، از باسورتھ اسمتھ صاحب، ایم۔ اے صفحہ ۶۳۔

تک یورپ میں چھپ گئیں۔ اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالکِ اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی۔ اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفینِ تاریخ اسلام۔ اور سوانح نگاران پیغمبر عرب کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

(۱) جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ اُن کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکابل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

(۲) جو عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی۔ لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی تصانیف کے دیکھنے سے ہمیں بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم ہستیاں ہیں۔ جن کو ابھی ہم نے دیکھا تھا اور اس سے نہ صرف ان کے تعصب۔ بلکہ ان کی جہالت کے رازِ نہاں کی بھی پردہ دری ہوتی ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے۔ لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ۔ ع۔

"دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں"

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے۔ لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

اب ہم اس امر پر بحث کرکے دکھلائیں گے کہ یورپ اسلام کی نسبت کیا رائے رکھتا ہے۔ اور مصنفین یورپ نے اسلام پر کیا نکتہ چینیاں کی ہیں۔ ان کی روایتوں سے کس درجہ

کا تعصب ظاہر ہوتا ہے۔ اور ان ہی کے بعض صاحب سمجھ و تنبیہ ت بھائیوں نے اسلام کی ہمہ گیر صداقت کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

یورپین مصنفین نے یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وغیرہ پر بھی بہت ساری نکتہ چینیاں کی ہیں کہ آپ معاذ اللہ شہوت پرست تھے۔ مفتری تھے۔ آپ نے پیغمبری کے جامہ میں بادشاہت کی۔ اور فوجی سپہ سالار بنے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ ہمارے مضمون کے عنوان کا تعلق مذہب اسلام کی نسبت ان کے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ لہٰذا ہم اسی موضوع پر زیادہ تر بحث کرینگے۔

قبل اس کے ان مسیحی علماء، پادریوں اور مورخین کے اقوال پیش کئے جائیں جن میں انہوں نے اسلامی توحید، وحی، قرآن کی حقانیت اور مذہب اسلام کی ہمہ گیر صداقت کا اقرار کیا ہے۔ یا ان اشخاص کا جنہوں نے ان باتوں پر نکتہ چینیاں کی ہیں۔ اور اس سے انکار کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم پہلے یورپ کے اس فاضل مصنف کے لکچر کا ماخذ بیان کریں جس میں اس نے بانیٔ اسلام کی نسبت جو نکتہ چینیاں ہوئی ہیں ان کا مختصر جواب دیا ہے۔ اور ان مسائل کا بھی جن کا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ جیسے وحی۔ قرآن کی حقانیت وغیرہ ھم اپنی تعریف تو آپ بھی کر سکتے ہیں لیکن ایک غیر مذہب والے سے اس کا سننا بڑی بات ہے۔ اور ہمارے لئے یہ بیان نہایت ہی کارآمد ہوگا۔ مسٹر کارلائل اپنی کتاب[۱] میں لکھتے ہیں۔

محمدؐ کو ہم نے اپنے لکچر کا ہیرو اس واسطے مقرر نہیں کیا کہ وہ انبیاؑ میں سب سے جلیل القدر ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان کی نسبت ہم کو زیادہ تر آزادی سے بحث کرنے کی گنجائش حاصل ہے۔ آپ کا سر مخفی معلوم کرنیکا طریقہ یہ ہے کہ اوّلاً ہم یہ سمجھیں کہ آپ دنیا سے کیا چاہتے تھے۔ تب اس کا جواب نکل آئے گا کہ دنیا نے ان کو کیا سمجھا۔ اور اب کیا سمجھتی ہے۔

---

[۱] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ تامس کارلائل۔

محمدؐ کی نسبت ہماری قوم کی عام رائے جو اب تک چلی آتی ہے۔ کہ آپ مفتری اور منصوبہ باز محض تھے۔ آپکا مذہب دعاوئے باطلہ کا مجموعہ اور ضعف عقلی کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے توہمات جو ہمارے خیر اندیش سرگرم لوگوں نے آپ سے منسوب کئے ہیں وہ الٹے خاص ہمارے حق میں باعث شرم و حقارت ہیں۔ مثلاً جب ڈاکٹر پوکاک صاحب نے گروشی اس سے پوچھا کہ اس قصّے کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت کے گوش مبارک میں ایک کبوتر کو دانا چگنا اس واسطے سکھلایا گیا تھا کہ وہ بمنزلہ فرشتہ وحی لوگوں کی نظروں میں دکھلائی دے۔ جب فاختہ چونچ سوراخ کان میں ڈالتی تو اس کو یہ جتایا جاتا کہ روح القدس فاختہ کی صورت میں آیا ہے[1]۔ گروشی اس نے اسکا جواب یہ دیا کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ہم ایسے خیالات خام کو خیر باد کہیں جو کلمہ اپنی زبان سے نکلا وہ اب تک برابر بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کی طرز زیست کا رہنما ہے۔ (یہ تخمینا مسلمانوں کی تعداد کا اس تصنیف کے زمانہ کے لحاظ سے درست ہے۔ مگر اب تو مسلمانوں کی تعداد لوچالیس کروڑ ہے) ان اٹھارہ کروڑ بندوں کو بھی خدا نے ہماری طرح پیدا کیا ہے۔ اس وقت کلمہ محمدی پر ایمان لانے والے دیگر ادیان اور مذاہب کے پیرو کی نسبت تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ جو کلمہ تعداد کثیر حصہ خلقت خدا کے حیات و ممات میں دستور العمل رہا ہو وہ ایک حقیر روحانی شعبدہ باز کی زبان سے نکلا تھا؟ مجھے تو ایسے گمان کا دل میں لانا ہی محال نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کی نسبت اور بہت سی باتوں کا تسلیم کر لینا میرے لئے آسان ہے۔ یہ باتیں زمانہ دہریت کا نتیجہ تھیں۔ اس زمانہ میں ہمارے خیال میں اس سے زیادہ ملحدانہ رائے کبھی شایع نہیں ہوئی۔

سوچو تو! کیا کوئی جھوٹا آدمی بانی مذہب ہو سکتا ہے۔؟

---

[1] اس کو سر والٹر رالیہ نے اپنی تواریخ عالم۔ جلد دوم حصہ اوّل باب ۶ میں نقل کیا ہے۔ اس کو مترجم قرآن مسٹر پرڈکس نے بھی حیاتِ محمدیؐ میں نقل کیا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک اناڑی۔ آدمی سے تعمیر مکان خشتی کا وقوع میں آنا۔ جبتک اس شخص کو جو مکان تیار کرے۔ اصلی خواص اور مصالح کار آمد ، کا استعمال ، معلوم نہ ہو اس کا ساختہ مکان مکان نہیں بلکہ خس و خاشاک ہوگا۔ اس قسم کے اناڑی کی ، عمارت بارہ صدی تک اٹھارہ کروڑ مخلوقات کی رہائش کے لئے کب ٹھیر سکتی ہے ؟ ۔ بلکہ وہ فوراً اسمار ہو جائے گی

بنائے ملت قائم کرنے کے لئے انسان کو قوانین فطرت اللہ کی پابندی بلکہ عین ، فطرت اللہ سے ہمرازی ، اور حقائق الاشیاء سے آگاہی لازمی ہے۔ ورنہ قانون فطرت صاف جواب دے گا کہ بس ع

"گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"

میرے خیال میں اس سے بہتر بیان اور مقبولیت ایک یورپین مؤرخ ، فاضل ، کی زبان سے نہیں ہو سکتی۔ جھوٹے دعوے کی مثالیں اسی مؤرخ نے اپنی کتاب میں ، بہت دئے ہیں اور یہ ثابت کر کے بتلایا ہے کہ ایسے دعوے چل نہیں سکتے۔ اور جنہوں نے اس طرح کے جھوٹے دعوے کئے۔ ان کے کیا نتائج نکلے۔ لہٰذا اسی بنا پر وہ کہتے ہیں "ہر کام میں صدق و اخلاص کی ضرورت ہے۔ اور یہ خداداد بات ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے کئی طبیں کو پیدا کیا۔ کیا اسی خدا نے انسان کو سید الاولین اور خاتم المرسلین نہیں بنایا۔ چونکہ وہ اپنا علم قادر مطلق کی القا کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اسلئے سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہو کر سننا چاہئے۔ پس ہم محمدؐ صاحب کو ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتے کہ وہ صرف ایک تہی باطن شخص تھا۔ اور ایک شعبدہ باز تھا۔ اور نہ ہم اس کو ایک حقیر جاہ طلب اور دیدہ و دانستہ منصوبہ باز کہہ سکتے ہیں۔ جو سخت اور کرخت پیغام اس نے دنیا کو سنایا۔ وہ ایک حقیقی اور سچا پیغام تھا۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے۔ اور نہ اعمال ہی اور نہ خالی از صداقت۔ یا کسی کی نقل و تقلید تھی۔ حیات ابدی کا ایک نورانی وجود تھا۔ جو بلا شبہ دنیا کو منور کرنے کے لئے پیدا

کیا گیا تھا۔

ہم نے فی الجملہ نقائص کے بارے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے۔ یہاں تک اتہامات کی تفاصیل نے اپنے اصل مرکزِ مفہوم کو مخفی کر دیا ہے۔ محمدؐ کی لغزشیں جو کبھی بھی حدِ ثبوت کو نہیں پہونچیں۔ اگر سچ بھی مان لئے جائیں تاہم اس کی اصلی اور حقانی ہونے کی بنیاد کو جنبش نہیں پہونچ سکتی۔"

اسلام کا میل الی الشہوت ہونے کی نسبت بہت کچھ تقریریں اور تحریریں ہوئیں اور یہ اعتراضات انصاف کی حد سے بڑھکر ہیں۔ سردارِ دو عالمؐ کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ آپ نفس پرست اور نعوذ باللہ عیاش تھے۔ سنئے ان کے جوابات بھی اسی فاضل مؤرخ کی زبان سے کیسے ادا ہو رہے ہیں۔

"عربوں میں پہلے جو برائیاں تھیں وہ محمدؐ صلعم کی ایجاد نہ تھی۔ بلکہ انہوں نے انکو قدیم سے مروج اور غیر معیوب پایا۔ مگر انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہ کیا کہ نہ صرف ان کو ایک ہی طرف سے روکا۔ بلکہ کئی پہلو سے آپ کا مذہب آسان نہیں۔ جس میں مشقت دہ روزی۔ غسل۔ وضو۔ روزہ۔ نہایت پیچیدہ رسومات۔ روزمرہ پنج وقتہ نماز۔ شراب سے پرہیز و اجتناب وغیرہ کیسی باتیں ہیں۔ محمدؐ بذاتہ جہاں تک ان کے حق میں گنجائش بیان ہے شہوت پرست انسان نہ تھے۔ آپ کی نسبت یہ خیال کرنا کہ آپ ایک معمولی نفس پرست کی طرح سفلی لہو و لعب پر پورے پورے شیدا تھے۔ اور کسی قسم کے تعیش پر مائل تھے۔ فاش غلطی ہے۔ آپ کے گھر میں اول درجہ کی کفایت شعاری برتی جاتی تھی۔ جَو کی روٹی اور پانی آپ کی معمولی غذا تھی۔ کبھی کبھی چولھے میں ایک ماہ تک آگ روشن نہ ہوتی تھی۔ اور اس بات کو فخر کے ساتھ قلمبند کیا جاتا ہے کہ حضرت اپنی نعلین مبارک آپ گانٹھ لیتے تھے۔ اور اپنا جبہ آپ مرمت کر لیتے تھے۔ آپ ایک محتاج غریب محنت مشقتی اور بے ساز و سامان آدمی تھے۔ آپ میں ایک اعلیٰ صفت موجود تھی ؛ ورنہ پُرجوش عرب جو ۲۳ سال تک آپکے زیر فرمان لڑتے رہے۔ اور ہمیشہ آپ کے قریب

مصاحب بنے رہے۔ اس قدر آپ کی تعظیم و تکریم نہ کرتے۔ وہ لوگ وحوش تھے۔ اور اکثر خونخوار جھگڑوں میں پڑتے تھے۔ ان پر حکمرانی کرنا بغیر قابلیت صحیحہ اور شجاعت واقعیہ محال تھا وہ ان کو پیغمبر کہہ کے خطاب کرتے تھے۔ آپ ان کے روبرو کھڑے ہوتے اور ان کے سامنے اپنی قبا کو پیوند لگاتے۔ اور اپنی جوتیاں خود مرمت کرتے۔ جنگ و جدل کرتے ! ان کے ساتھ مشورہ کرتے۔ اور حکم دیتے۔ اُن لوگوں نے ضرور دیکھ لیا ہوگا کہ وہ کس قسم کے انسان تھے۔ آپ کے فرمانوں کی تعمیل جیسے اپنے کانٹے ہوئے جبہ میں ہوتی تھی۔ ویسے کسی شہنشاہ تاجدار کے احکام کی نہیں ہوئی۔ تیس سال کے کڑے امتحانوں میں۔ میں آپ میں وہ وصف بذاتہٖ دیکھتا ہوں جو ایک حقیقی ہیرو بننے کے لئے لازم ہیں۔"

یہاں تک تو بانی اسلام کے متعلق جو اعتراضات ہوئے ہیں اور جن کا تعلق زیادہ تر آپکی ذات سے نہیں بلکہ مذہب سے ہے۔ ان اعتراضات اور ان کے جوابات یورپین مؤرخ کی ہی زبانی پیش کئے گئے۔ اب ہم بتدریج یہ دکھلانے کی کوشش کرینگے کہ اسلام کے دیگر اصول و مسائل کی نسبت کیا کیا اعتراضات ہوئے ہیں۔ اور ان کے جوابات بھی ان ہی کے فاضل بھائیوں کی زبانی پیش کرینگے۔

قرآن پاک کی نسبت۔ اسلام کے ساتھ یورپین مؤرخین کا یہ اعتراض ہے کہ وہ الہامی نہیں بلکہ خود ساختہ ہے۔ اور آنحضرت نے یہود و نصاریٰ کی تعلیم سے مستفید ہو کر اپنا ایک خیالی مذہب ایجاد کیا۔ ان اعتراضات کی وجہ محض تعصب ہے۔ جو جنگ ہائے صلیبی کے وقت سے نسلاً بعد نسلاً چلا آتا ہے۔ اب ہم پہلے یورپ والوں کے ان اعتراضات کو ان ہی کے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ اور پھر ان ہی کے صاحب بصیرت و غیر متعصب بھائیوں کے۔ ان کے بڑے بڑے علماء و پادریوں کے اقوال کو پیش کریں گے جن میں انہوں نے اسلامی توحید۔ وحی۔ قرآن کی حقانیت ! اور مذہب اسلام کی ہمہ گیر صداقت و برگزیدگی کا اقرار کیا ہے۔

ٹسڈل ۔ لکھتا ہے کہ "اسلام نہ کوئی آسمانی مذہب ہے نہ حقانی ۔ نہ قرآن کلام اللہ ہے بلکہ پیغمبر اسلام نے خود تمام مذاہب موجودہ یعنی یہودی مسیحی ۔ زرتشتی وغیرہ سے واقفیت حاصل کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ۔"

سر ولیم میور لکھتا ہے " یہودیوں کی کتابوں اور قصوں کے ایک بڑے حصے کا علم حاصل کرنا ۔ اپنے پہلے ذخیرے کے ساتھ ان کو جوڑنا ۔ مقفیٰ سورتوں میں ان کو ڈھالنا ۔ ، ایک ایسا کام تھا جس کے پورا کرنے کے لئے بیشک بڑی محنت اور وقت کی ضرورت تھی ۔ اور حضرت محمدؐ نے بیشک اس بارے میں بڑی محنت سے کام لیا ہوگا ۔"

راڈویل ۔ لکھتا ہے " چونکہ حضرت محمدؐ نے یہودان عرب اور مسیحی مخبروں سے تعلیم حاصل کرنے میں نہایت اخفاء سے کام لیا ۔ اس لئے وہ اس بات کے قابل ہوئے کہ تمام مکے کے جاہل بُت پرست عربوں کے آگے ۔ بڑی دلیری سے اپنی سیکھی ہوئی باتوں کے وحی الہیٰ ہونے کا اعلان کریں ۔ اس کے جواب میں پہلے ہم یورپ کے ایک مؤرخ کی زبان سے اس زمانے کی تعلیمی حالت کا ذکر کریں گے ۔ اور اس کے بعد مسیحی علماء و پادریوں کے اقوال کو پیش کریں گے ۔

نویں ۔ اور دسویں صدی میں یورپ کی جو تعلیمی حالت تھی اس کے متعلق لیبان کی رائے ملاحظہ کے قابل ہے ۔ وہ لکھتا ہے ۔

" اگر ہم یورپ کی نویں اور دسویں عیسوی کی حالت جس وقت مسلمانوں کا تمدن اندلس میں اعلیٰ درجے کی ترقی پر تھا ۔ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے علمی مرکز بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے ۔ جہاں ہمارے امراء نیم وحشی حالت میں رہتے تھے ۔ اور اس پر فخر کرتے تھے کہ انہیں لکھنا ، پڑھنا نہیں آتا ۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے راہب تھے ۔ جو اپنے وقت کو مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے ۔ اہل یورپ کی وحشیانہ حالت ایک زمانہ دراز تک ایسی شدید رہی کہ خود ان کو اس کا احساس نہ تھا ۔

البتہ گیارھویں ۔ اور زیادہ سے زیادہ بارھویں صدی میں کچھ قدر علمی امنگیں پیدا

ہو گئیں۔ لیکن جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے کفن کے پھاڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے عربوں کی طرف جو اس زمانہ کے اساتذہ تھے رجوع کی۔

اب اتنا جاننے پر بھی یورپین معترضین کا یہ کہنا کہ آنحضرتؐ نے اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ یا یہودی وغیرہ کی صحبت سے علم حاصل کر کے اسی بنا پر اپنا من گھڑت مذہب ایجاد کیا۔ کتنا لغو خیال ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں ان لوگوں میں علم تھا ہی کب؟ وہ حد درجے کے وحشی تھے۔ پھر ایک ایسے شخص کا جو خود بھی ان پڑھ ہو۔ ایسے آدمیوں میں پیدا ہونا جن کی جہالت کی حالت اس درجے کی ہو جن کی تعلیمی حالت بھی اس درجے گری ہوئی ہو۔ اس شخص کا ان پڑھ ہو کر اتنی اعلیٰ تعلیم دینی کیا ظاہر کرتا ہے کہ پیغمبر اور ان کی تعلیم خدا کی طرف کی نہ تھی تو اور کیا تھی؟۔

جب یورپ کی تعلیمی حالت کا یہ حال تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جاہل شخص کسی دوسرے بے علم کو کچھ سکھا اور بتا سکتا ہے۔ اسلام ہی نے ان وحشیوں کو اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ تمدن کی تعلیم دی۔ سخت ہی یہ بے انصافی ہوگی۔ اگر ہم یہ ظاہر نہ کریں کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب میں نصرانیت، یہودیت، اور مجوسیت، رائج تھے۔ نصرانیت کو اس درجہ ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے۔ مثلاً ورقہ بن نوفل جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے۔ متعدد ایسے تھے جنہوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا یا تھا۔ اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں تھیں۔ اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرتؐ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا تو اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے۔ "ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے"۔

اب ہم ان مسیحی علماء دپادریوں کے اقوال کو پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے مذہب

اسلام کی حقانیت کو قبول کیا ہے۔

پروفیسر آرنسٹ بکل جرمنی کا قول ہے اسلامی توحید کے متعلق:۔

"عیسائی مذہب کو توحید کا مذہب کہنا۔ ایک بڑی بیہودہ اور نامعقول بات ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں عیسائی مذہب ایک مشرکانہ مذہب ہے۔ کیونکہ اس میں صرف تین خدا ہیں۔ ہی نہیں کہے جاتے۔ بلکہ مریمؑ۔ اور ہزارہا اولیا ایسے بنائے گئے ہیں۔ جن میں خدائی صفات پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ توحید کا مذہب جو دنیا میں ہے وہ اسلام ہے۔"

سر جان ملکم۔ کہتے ہیں" اسلامی توحید سے بہتر و برتر کچھ نہیں اسلئے کہ وہ ہر طرف سے پلٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ چنانچہ قرآن و حدیث سے، صحابہؓ کے ارشادات سے۔، شعار اسلام سے، ان کے قول و فعل سے، بالکل ظاہر ہے کہ جس طرف مڑو گے اسی طرف خدا کا سامنا ہے۔ فقط خدا کو لایقِ عبادت جانتے ہیں۔ اور مخلوقات میں سے کسی کو اس امر میں اس کا شریک نہیں کرتے۔"

اِس سے ظاہر ہے کہ آرنسٹ اپنے مذہب کی کمزوری کو کیسے محسوس کرتا ہے، اور اسلامی توحید کا کس طرح اعتراف کرتا ہے۔ اب دیکھئے قرآن پاک کی نسبت یورپین مؤرخین کی کیا رائے ہے۔

مسٹر جارج سیل، مترجم قرآن شریف کا قول ہے کہ" کسی انسان کا قلم معجزانہ کتاب کو نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے۔ جو مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے بہت بلند ہے۔ (اس کا اشارہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے) اور تنہا یہ صحیفہ دنیا کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے۔

مؤرخ گبن لکھتا ہے: "قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے صادق کا کلام ہے۔ اور صداقت سے پُر ہے۔ میرے نزدیک قرآن شریف کے تمام معانی میں سچائی کا جوہر موجود ہے۔ قرآن مجید میں تمام انتہائی خوبیاں موجود ہیں۔ اور ہر قسم کے

او معانی میں وہ لاثانی ہے۔

اب مذہب اسلام کی نسبت بھی ان کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

پادری گیرہم بارٹن۔ اپنے لیکچر ۱۹۱۶ء میں کہتے ہیں "بیشک میں امید کرتا ہوں کہ تمام عیسائی مذہب اسلام کو ایک عظیم الشان صورت میں دیکھیں گے۔ جو دنیا کو بہت بڑا نفع پہونچانے والے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب اسلام کے بغیر دنیا اس قدر نیک اور اچھی حالت میں ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ جیسی اب ہے۔ میں مذہب اسلام کی حقانیت اور جبروت کے آگے اپنی گردن جھکاتا ہوں"۔

سرولیم میور۔ کا قول ہے "بیشک میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے مذہب اسلام میں پرہیزگاری، خدا ترسی، ایسے کامل درجے پر ہے۔ جو دوسرے مذاہب میں ہرگز نہیں پائی جاسکتی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اخلاق انسان کی ترقی کا باعث صرف اسلام ہی ہوا ہے"۔

موسیو لیون راس۔ ایک یورپین مؤرخ کا قول ہے "دینِ اسلام تمام دوسرے مذاہب سے بہتر اور افضل ہے۔ جو لوگ اس میں عیب نکالتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اسلام ایک جامع الکمالات قانون ہے۔ جس کو انسانی۔ طبعی۔ اقتصادی۔ اور اخلاقی قانون کہنا بالکل بجا ہے۔ اور درست ہے۔ زمانۂ حال میں جتنے قوانین، نوعِ انسانی کی فلاح کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ وہ سب اِس مقدس مذہب میں پہلے سے موجود ہیں"۔

ایک کتاب یورپین مصنف کی لکھی[1] ہوئی۔ اس میں لکھا ہے کہ "اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جس کے اصول میں سب کو اتفاق ہے۔ اور ایسی کوئی بات نہیں جو زبردستی

---

[1] اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن گاڈفرے ہگنس۔

ماننی پڑے۔"

یہاں تک تو قرآن پاک کا الہامی نہ ہونیکا ذکر تھا۔ اور یہ تبلایا گیا کہ کیا اعتراضات تھے۔ اور اس کے جوابات بھی دیئے گئے۔ اور یوروپین علماء و پادریوں کے اقوال بھی پیش کئے گئے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یورپ قرآن اور مذہب اسلام کی حقانیت کو کس طرح قبول کرتا ہے۔

اب ایک اور اعتراض قرآن پاک کی نسبت یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بے ترتیب ہے اس کی نسبت بھی۔ ہم کارلائل کی کتاب "اسلام اور اس کا بانی" سے کچھ اقوال پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"جس مقدس کتاب کو ہم محمدی قرآن کہتے ہیں یہ وہ کتاب ہے جو ہجرت مکہ کے بعد آپ نے ان پرجوش غزوات اور جد وجہد کے بیچ میں لکھوایا ہے کہ جب آپ کو الہام ہوا اوسی وقت یاد اور قلمبند کر لیا گیا ہے یہ کتاب وہ ہے۔ جس پر آپ اور آپ کے متبعین نے بہت کچھ فخر کیا۔ اور تمام دنیا سے سوال کیا گیا کہ وہ معجزہ نہیں؟

عرب اس وقت فصاحت و بلاغت، شاعری۔ اور تمدن میں مشہور تھے ان کی فصاحت و بلاغت مسلم تھی۔ اور اپنا ہمسر کوئی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب یہ پر فصاحت کلام ربانی ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ کیا وہ اس سے بہتر کلام کہہ سکتے ہیں۔ تو دنگ ہوگئے۔ اور اس کو کلام ربانی تسلیم کیا۔ مسلمانوں کا یہ دستور العمل ہے۔ دنیا میں اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسجدوں میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ و ملہ ۱۲ سو سال تک اتنے کثیر انسانوں کے دلوں میں اور کانوں میں اس کتاب کی آواز ہر لحظہ پہنچتی رہی۔ مگر یہ ایک بار خاطر۔ نہایت ادق۔ اور بلا ترتیب کلام ہے۔"

اس سے کلام ربانی میں فرق نہیں آسکتا۔ وہ نتیجہ نکل سکتا ہے مسٹر سیل مترجم قرآن اپنی زبان میں قادر الکلام نہیں۔ ورنہ اصل اعجاز معنوی و لفظی قرآن مجید صرف اس سے ثابت ہے

کہ تیرہ صدی گذر جانے کے بعد بھی۔ اور خود زبانِ عرب میں بسیار انقلاب آ جانے کے باوجود بھی تمام اہل زباں اور عربی دان۔ سن اور پڑھ کر جوش سے پھڑک جاتے ہیں۔ اور وجد میں آجاتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک اور نامور انگریز کے خیالات سنیئے:-

مسٹر ایچ جی ویل۔ کہتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے اس دنیا میں بہت کچھ کام کیا۔ ان کی سوانح ایسے بڑے آدمی کی بے مثل مثال ہے جس نے کسی انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہو اس اکیلے انسان نے اپنی قوم کی شوکت قائم کرکے اُسے کمال کو پہونچا دیا۔ اور اپنی زبان کو نصف روئے زمین پر پھیلا دیا۔ بارہ۔ تیرہ سو برس پہلے کے استعمال کئے ہوئے الفاظ۔ آج لندن ۔ پیرس۔ برلن میں۔ مکہ میں جہاں اس نے تکلیف اٹھائی۔ مدینہ میں جہاں اس کا انتقال ہوا۔ قسطنطنیہ۔ قاہرہ۔ فیض۔ ٹمبکٹو۔ بیت المقدس۔ دمشق۔ مصر۔ بصرہ بغداد۔ بخارا۔ کابل۔ کلکتہ۔ پیکن۔ متوسط ایشیا۔ مجمع الجزائر میں۔ ایسی سرزمینوں میں جن کا ابھی نقشہ میں پتہ نہیں۔ بے آب وگیاہ صحراؤں میں۔ غیر معلوم چشموں پر بسے ہوئے گمنام گاؤں میں۔ بڑے بڑے فاضل اور معتقد مطالعہ کر رہے ہیں۔

یہ حضرت محمدؐ تھے۔ جنہوں نے یہ سب کر دکھایا۔ کیونکہ ان کے ذریعے کتاب ظہور میں آئی۔ جس کی بدولت ان کی زبان پھیلی"۔

قرآن کی بے ترتیبی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ متبعین محمدؐ نے جیسا کہ نزولِ وحی کے وقت قلمبند ہوا تھا۔ ویسا ہی اجوا میں پڑا پایا۔ کہتے ہیں کہ بہت کچھ حصہ اس کا بکریوں کے کندھے کی ہڈیوں پر مرقوم تھا۔ اور یہ ہڈیاں متفرق طور پر صندوق میں پھینکی ہوئی تھیں ۔ اور انہوں نے بلا لحاظ کسی بین ترتیبِ وقت یا دیگر اس کو شائع کر دیا:-

اقوال بالائے قرآن کی نسبت جو جو اعتراضات ہوئے اور ان کے جوابات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب کوئی بات کی اس بارے میں کمی باقی نہ رہی ہو۔

ہم نے حتےٰ الوسع کوشش کر کے سب باتیں تبلائی ہیں ۔ بہت ساری باتیں اور ہوں گی لیکن مضمون ایسا طویل ہے۔ اور اس میں کئی اور باتیں تبلائی؛ اور ان کے اعتراضات کے، ساتھ ان کے جواب دیئے ہیں ۔ لہٰذا ہم اس بحث کو اسی پر اختصار کر کے آگے، بڑھتے ہیں ۔

اب ہم اس اعتراض کو پیش کر کے بحث کریں گے اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔

اسلام اور تلوار۔ ایک غیر مسلم جب تاریخِ اسلام پر سرسری نظر ڈالتا ہے تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے کن اسباب کے ماتحت اس قدر جلد۔ اور ایسی مکمل ترقی کی ۔ کیوں اسوقت چالیس کروڑ نفوسِ انسانی نے اس مذہب کو اختیار کر رکھا ہے۔

بعض مغربی مؤرخین نے بڑی کاوشوں سے اسکا سبب بیان کرتے ہوئے۔ صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ مذہبِ اسلام کی قوت کی سب سے بڑی دلیل اس کی تلوار تھی جس نے دنیا سے اپنی صداقت بجبر تسلیم کرا لی ۔ لیکن شاید انہوں نے اپنے ہی ملک کے، ایک فاضل (کارلائل) کا جواب نہیں سنا کہ اگر مذہب تلوار سے پھیلا تو ظاہر ہے کے، اس کے لئے تلوار چلانے والے پہلے پیدا کر لئے ہوں گے ۔ اور یہ تلوار چلانے والے وہی تھے جو بغیر قوتِ شمشیر محض اخلاق کی وجہ اور اس کی قوت سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے ۔ مسٹر کارلائل کا جواب اس بارے میں نہایت موزون اور دلچسپ ہے۔، وہ کہتے ہیں کہ

"مذہبِ اسلام کا بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کی نسبت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بیشک مذہبِ عیسوی کی نسبت اس امر کا فخر بدرجہا بھلا معلوم دیتا ہے کہ اس کی اشاعت بلا جدال و قتال بذریعہ پند و وعظ بطریقِ ثبوت وحی ہوئی ۔ تاہم معہٰذا اس بات کو کسی مذہب کے صدق و کذب کی دلیل گردانا بڑی بھاری غلطی ہے ۔ بیشک شمشیر

نکالو۔ لیکن یہ بتلاؤ کہ شمشیر لوگے کہاں سے۔؟

محمدؐ صلعم پر جب پہلے وحی نازل ہوئی تو آپ پر فرض ہوگیا کہ تمام مخلوق پر ظاہر کردیں۔ سب سے پہلے آپ کی صالحہ بیوی حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں۔ آپ اس وقت ایمان لائیں۔ جب کوئی ایمان لانے والا نہ تھا۔ لہذا آپ ان کا احسان کبھی نہیں بھولے۔ بعدازاں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ آپ پر ایمان لائے۔ آپ نے اپنے عقائد کی تلقین ہر ایک شخص کو کی۔ لیکن بہتوں نے استہزا کیا۔ اور بعضوں نے بے پروائی کی نگاہ سے دیکھا۔ میرے خیال میں تین سال کے عرصہ میں صرف تیرہ پیرو ملے۔ آپ کے اشاعت اسلام کے دل بڑھانے والے سامان۔ وہی معمولی تحریک اور ترغیب کے وسائل تھے۔ جو آپ کے ابنائے جنس کو ایسی حالت میں حاصل ہوتے ہیں آپ نے اپنے چالیس رشتہ دار کو مدعو کیا۔ اور جو آپ کا دعوے تھا کہہ سنایا۔ دور دور کے آدمیوں میں اعلان کروایا۔ لوگوں نے یہ خیال کرکے کہ آپ اور ایک سولہ سالہ لڑکا علیؓ (آپکا معاون) تمام دنیا کے خیالات کے برخلاف کیا کوشش کر سکینگے۔ اس بات کو ایک مضحکہ سمجھا گیا۔ اور مجمع قہقہہ لگاکر منتشر ہوگیا۔

حضرت محمدؐ نے جب اہل قریش کو اسلام کی دعوت دی۔ اور ان کے بتوں کی مذمت کی تو ہر ایک یہ کہہ اٹھا کہ وہ کون ہے جو ہمسے دانا تر ہونیکا دعوے کرتا ہے۔ اور ہم سب کو محض بیوقوف، اور لکڑی کے پرستار سمجھکر ملامت کرتا ہے۔ ابوطالب نے نرمی سے کہا کہ خاموش ہوجاؤ۔ اور رؤسا کی غضب آوری سے باز آؤ۔ اور اپنے ساتھ دوسرون کو بھی خطرہ میں نہ ڈالو۔ مگر آپ نے کہا کہ اگر آفتاب میرے دائیں ہاتھ کی طرف اور ماہتاب بائیں ہاتھ کی طرف کھڑے ہوکر کہیں کہ چپ رہو۔ تب بھی میں ان کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ کوئی معمولی اور آسان کام نہ تھا۔ آپ ہر ایک کو وعظ سناتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ یا علانیہ خطرات۔ دائمی مخالفت اور نفرت کا آپ شکار بنے رہے۔ قریش

ڈرل۔ لکھتا ہے کہ اسلام نہ کوئی آسمانی مذہب ہے نہ حقانی۔ نہ قرآن کلام رب بلکہ پیغمبر اسلام نے خود تمام مذاہب موجودہ یعنی یہودی مسیحی۔ زرتشتی وغیرہ سے واقفیت حاصل کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔

سر ولیم میور لکھتا ہے "یہودوں کی کتابوں اور قصوں سے ایک بڑے حصے کا علم حاصل کرنا اپنے پہلے ذخیرے کے ساتھ ان کو جوڑنا۔ مختلف شعر و نغمہ میں ان کو ڈھالنا۔ ایک ایسا کام تھا جس کے پورا کرنے کے لیے بیشک بڑی محنت اور وقت کی ضرورت تھی اور حضرت محمدؐ نے بیشک اس بارے میں بڑی محنت سے کام لیا ہوگا"

راڈویل۔ لکھتا ہے چونکہ حضرت محمدؐ نے یہود ان رب اور مسیحی وغیرہ سے تعلیم حاصل کرنے میں نہایت اخفا سے کام لیا اس لئے وہ اس بات کے قابل ہوئے کہ تمام مکے کے جاہل بت پرست عربوں کے آگے۔ بڑی دلیری سے اپنی سیکھی ہوئی باتوں کے وحی الٰہی ہونے کا اعلان کریں۔ اس کے جواب میں پہلے ہم یورپ کے ایک مؤرخ کی زبان سے اس زمانے کی تعلیمی حالت کا ذکر کریں گے۔ اور اس کے بعد مسیحی علماء و پادریوں کے اقوال کو پیش کریں گے۔

نویں۔ اور دسویں صدی میں یورپ کی جو تعلیمی حالت تھی اس کے متعلق لیبان کی رائے ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"اگر ہم یورپ کی نویں اور دسویں عیسوی کی حالت جس وقت مسلمانوں کا تمدن اندلس میں اعلیٰ درجے کی ترقی پر تھا۔ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے علمی مرکز بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے۔ جہاں ہمارے امراء نیم وحشی حالت میں رہتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے راہب تھے۔ جو اپنے وقت کو اہل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ اہل یورپ کی وحشیانہ حالت ایک زمانہ دراز تک ایسی شدید تھی کہ خود ان کو اس کا احساس نہ تھا۔

البتہ گیارہویں۔ اور زیادہ سے زیادہ بارہویں صدی میں کسی قدر علمی امنگیں پیدا

ہوئے لگیں۔ لیکن جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے کفن کے پھاڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے عربوں کی طرف جو اس زمانہ کے اساتذہ تھے رجوع کی۔

اب اتنا جاننے پر بھی یورپین معترضین کا یہ کہنا کہ آنحضرتؐ نے اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ راہبوں وغیرہ کی صحبت سے علم حاصل کر کے اسی بنا پر اپنا من گھڑت مذہب ایجاد کیا۔ کتنا لغو خیال ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں ان لوگوں میں علم تھا ہی کب؟ وہ حد درجے کے وحشی تھے۔ پھر ایک ایسے شخص کا جو خود بھی ان پڑھ ہو۔ ایسے آدمیوں میں پیدا ہونا جن کی جہالت کی حالت حد درجے کی ہو۔ جن کی تعلیمی حالت بھی اس درجے گری ہوئی ہو۔ اس شخص کا خود ان پڑھ ہو کر اتنی اعلیٰ تعلیم دینی کیا ظاہر کرتا ہے کہ پیغمبر اور ان کی تعلیم خدا کی طرف کی نہ تھی تو اور کیا تھی؟۔

جب یورپ کی تعلیمی حالت کا یہ حال تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جاہل شخص کسی دوسرے بے علم کو کچھ سکھا اور بتا سکتا ہے۔ اسلام ہی نے ان وحشیوں کو اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ تمدن کی تعلیم دی۔ ساتھ ہی یہ بے انصافی ہوگی۔ اگر ہم یہ ظاہر نہ کریں کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب میں نصرانیت، یہودیت، اور مجوسیت رائج تھے۔ نصرانیت کو اس درجہ ترقی ہو چکی تھی۔ کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے۔ مثلاً ورقہ بن نوفل جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے۔ متعدد ایسے تھے جنہوں نے شام میں جاکر تعلیم پائی تھی۔ مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا یا تھا۔ اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں تھیں۔ اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرتؐ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا تو اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے خود قرآن مجید میں ہے "ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے"۔

اب ہم ان مسیحی علماء و پادریوں کے اقوال کو پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے مذہب

اسلام کی حقانیت کو قبول کیا ہے۔

پروفیسر آرنسٹ بکل جرمنی کا قول ہے اسلامی توحید کے متعلق :-

"عیسائی مذہب کو توحید کا مذہب کہنا ایک بڑی بیہودہ اور نامعقول بات ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں عیسائی مذہب ایک مشرکانہ مذہب ہے۔ کیونکہ اس میں صرف تین خدا ہیں نہ ہی نہیں کہے جاتے۔ بلکہ مریم۔ اور ہزارہا اولیا ایسے بنائے گئے ہیں جن میں خدائی صفات پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ توحید کا مذہب جو دنیا میں ہے وہ اسلام ہے"

سر جان ملکم لکھتے ہیں "اسلامی توحید سے بہتر و برتر کچھ نہیں اسلئے وہ ہر طرف سے پلٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ چنانچہ قرآن و حدیث سے صحابہ کے ارتداد سے شعار اسلام سے ان کے قول و فعل سے بالکل ظاہر ہے کہ جس طرف مڑ گئے اسی طرف خدا کا سامنا ہے۔ فقط خدا کو لائق عبادت جانتے ہیں۔ اور مخلوقات میں سے کسی کو اس امر میں اس کا شریک نہیں کرتے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ آرنسٹ اپنے مذہب کی کمزوری کو کیسے محسوس کرتا ہے، اور اسلامی توحید کا کس طرح اعتراف کرتا ہے۔ اب دیکھئے قرآن پاک کی نسبت یورپین مؤرخین کی کیا رائے ہے۔

مسٹر جارج سیل مترجم قرآن شریف کا قول ہے کہ "کسی انسان کا قلم معجزانہ کتاب کو نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے۔ جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے بہت بلند ہے۔ (اس کا اشارہ حضرت عیسیٰ کی طرف ہے) اور تنہا یہ صحیفہ دنیا کو اس کے الہامی ہونے کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے۔

مورخ گبن لکھتا ہے "قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدائے صادق کا کلام ہے۔ اور صداقت سے پر ہے۔ میرے نزدیک قرآن شریف کے تمام معاملات میں سچائی کا جوہر موجود ہے۔ قرآن مجید میں تمام انتہائی خوبیاں موجود ہیں۔ اور ہر قسم

اور عادات حمیدہ کا معدن ہے۔"

اب مذہب اسلام کی نسبت بھی ان کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

پادری گریہم بارٹن۔ اپنے لکچر ۱۹۱۶ء میں کہتے ہیں" بیشک میں امید کرتا ہوں کہ تمام عیسائی مذہب اسلام کو ایک عظیم الشان صورت میں دیکھیں گے۔ جو دنیا کو بہت بڑا نفع پہونچا رہا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب اسلام کے بغیر دنیا اس قدر نیک اور اچھی حالت میں ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ جیسی اب ہے۔ میں مذہب اسلام کی حقانیت اور جبروت کے آگے اپنی گردن جھکاتا ہوں۔"

سر ولیم میور۔ کا قول ہے" بیشک میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے مذہب اسلام میں پرہیزگاری، خدا ترسی، ایسے کامل درجے پر ہے۔ جو دوسرے مذاہب میں ہرگز نہیں پائی جاسکتی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اخلاق انسان کی ترقی کا باعث صرف اسلام ہی ہوا ہے۔"

موسیو لیون راش۔ ایک یورپین مؤرخ کا قول ہے" دین اسلام تمام دوسرے مذاہب سے بہتر اور افضل ہے۔ جو لوگ اس میں عیب نکالتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اسلام ایک جامع الکمالات قانون ہے۔ جس کو انسانی۔ طبعی۔ اقتصادی۔ اور اخلاقی قانون کہنا بالکل بجا ہے۔ اور درست ہے۔ زمانۂ حال میں جتنے قوانین نوع انسانی کی فلاح کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ وہ سب اس مقدس مذہب میں پہلے سے موجود ہیں۔"

ایک کتاب یورپین مصنف کی لکھی ہوئی[1]۔ اس میں لکھا ہے کہ" اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جس کے اصول میں سب کو اتفاق ہے۔ اور ایسی کوئی بات نہیں جو زبردستی

---

[1] اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن۔ گاڈفرے ہگنس۔

مان لینی پڑے:۔

یہاں تک تو قرآن پاک کا الہامی نہ ہونیکا ذکر تھا۔ اور یہ تبلایا گیا کہ کیا اعتراضات تھے۔ اور اس کے جوابات بھی دئے گئے۔ اور یورپین علماء و پادریوں کے اقوال بھی پیش کئے گئے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یورپ قرآن اور مذہب اسلام کی حقانیت کو کس طرح قبول کرتا ہے۔

اب ایک اور اعتراض قرآن پاک کی نسبت یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بے ترتیب کلام ہے اس کی نسبت بھی۔ ہم کارلائل کی کتاب "اسلام اور اس کا بانی" سے کچھ اقوال پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

جس مقدس کتاب کو ہم محمدی قران کہتے ہیں یہ وہ کتاب ہے جو ہجرت مکہ کے بعد آپ نے ان پرجوش غزوات اور جد وجہد کے بیچ میں لکھوایا ہے کہ جب آپ کو الہام ہوا اور جس وقت یاد اور قلمبند کر لیا گیا ہے یہ کتاب وہ ہے۔ جس پر آپ اور آپ کے متبعین نے بہت کچھ فخر کیا۔ اور تمام دنیا سے سوال کیا گیا کہ وہ معجزہ نہیں ؟

عرب اس وقت فصاحت وبلاغت۔ شاعری۔ اور تمدن میں مشہور تھے ان کی فصاحت، بلاغت مسلّم تھی۔ ۔ ۔ وہ اپنا ہمسر کوئی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب یہ پُر فصاحت کلام ربّانی ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ کیا وہ اس سے بہتر کلام کہہ سکتے ہیں۔ تو دنگ ہو گئے۔ اور اس کو کلام ربانی تسلیم کیا۔ مسلمانوں کا یہ دستور العمل ہے۔ دنیا میں اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسجدوں میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ ۱۲۰۰ سو سال تک اتنے کثیر انسانوں کے دلوں میں اور کانوں میں اس کتاب کی آواز ہر لحظہ پڑھتی رہی۔ مگر یہ ایک بارِ خاطر۔ نہایت ادق۔ اور بلا ترتیب کلام ہے:۔

اس سے کلام ربانی میں فرق نہیں آسکتا۔ اور نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سیل مترجم قرآن اپنی زبان میں قادر الکلام نہیں۔ ورنہ اصل اعجاز معنوی ولفظی قرآن مجید صرف اس سے ثابت ہے

کہ تیرہ صدی گذر جانے کے بعد بھی۔ اور خود زبانِ عرب میں بسیار انقلاب آجانے کے باوجود بھی
تمام اہل زبان اور عربی دان۔ سن اور پڑھ کر جوش سے پھڑک جاتے ہیں۔ اور وجد میں
آجاتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک اور نامور انگریز کے خیالات سُنئے۔

مسٹر ایچ۔ جی۔ ویل۔ کھتے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے اس دنیا میں بہت کچھ کام کیا۔
ان کی سوانح ایسے بڑے آدمی کی بے مثل مثال ہے۔ جس نے کسی انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہو
اس اکیلے انسان نے اپنی قوم کی شوکت قائم کرکے اُسے کمال کو پہونچا دیا۔ اور اپنی زبان کو نصف
روئے زمین پر پھیلا دیا۔ بارہ سو برس کے استعمال کئے ہوئے الفاظ۔ آج لندن کے
پیرس۔ برلن میں۔ مکہ میں جہاں اس نے تکلیف اٹھائی۔ مدینہ میں جہاں اس کا انتقال
ہوا۔ قسطنطنیہ۔ قاہرہ۔ فیض۔ ٹمبکٹو۔ بیت المقدس۔ دمشق۔ مصر۔ بصرہ۔ بغداد۔ بخارا۔
کابل۔ کلکتہ۔ پیکن۔ متوسط ایشیا۔ مجمع الجزائر میں۔ ایسی سرزمینوں میں جنکا ابھی نقشہ میں
پتہ نہیں۔ بے آب وگیاہ صحراؤں میں۔ غیر معلوم چشموں پر بسے ہوئے گمنام گاؤں
میں۔ بڑے بڑے فاضل اور معتقد مطالعہ کر رہے ہیں۔

یہ حضرت محمدؐ تھے۔ جنہوں نے یہ سب کر دکھایا۔ کیونکہ ان کے ذریعے کتاب ظہور
میں آئی۔ جسکی بدولت ان کی زبان پھیلی"۔

قرآن کی بے ترتیبی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ متبعین محمدؐ نے جیسا کہ نزولِ
وحی کے وقت قلمبند ہوا تھا۔ ویسا ہی اجزا میں پڑا پایا۔ کھتے ہیں کہ بہت کچھ حصہ اس
کا بکریوں کے کندھے کی ہڈیوں پر مرقوم تھا۔ اور یہ ہڈیاں متفرق طور پر صندوق میں
پھینکی ہوئی تھیں۔ اور انہوں نے بلا لحاظ کسی بین ترتیبِ وقت یا دیگر اس
کو شائع کر دیا"۔

اقوال بالائے قرآن کی نسبت جو جو اعتراضات ہوئے اور ان کے جوابات بھی ؎
پیشتر لکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی بات کی اس بارے میں کمی باقی نہ رہی ہو۔

ہم نے حتی الوسع کوشش کرکے سب باتیں تبلائی ہیں ۔ بہت ساری باتیں اور ہوں گی لیکن مضمون ایسا طویل ہے ۔ اور اس میں کئی اور باتیں تبلائی ؛ اور ان کے اعتراضات کے ، ساتھ ان کے جواب دیئے ہیں ۔ لہٰذا ہم اس بحث کو اسی پر اختصار کرکے آگے ، بڑھتے ہیں ۔

اب ہم اس اعتراض کو پیش کرکے بحث کریں گے اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ۔

اسلام اور تلوار ۔

ایک غیر مسلم جب تاریخ اسلام پر سرسری نظر ڈالتا ہے تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے کن اسباب کے ماتحت اس قدر جلد ۔ اور ایسی مکمل ترقی کی ۔ کیوں اسوقت چالیس کروڑ نفوسِ انسانی نے اس مذہب کو اختیار کر رکھا ہے ۔

بعض مغربی مؤرخین نے بڑی کاوشوں سے اسکا سبب بیان کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ مذہبِ اسلام کی قوت کی سب سے بڑی دلیل اس کی تلوار تھی جس نے دنیا سے اپنی صداقت بجبر تسلیم کرا لی ۔ لیکن شاید انہوں نے اپنے ہی ملک کے ، ایک فاضل (ڈ کا لائل) کا جواب نہیں سنا کہ اگر مذہب تلوار سے پھیلا تو ظاہر ہے کے ، اس کے لئے تلوار چلانے والے پہلے پیدا کرلئے ہوں گے ۔ اور یہ تلوار چلانے والے وہی تھے جو بغیر قوتِ شمشیر محض اخلاق کی وجہ اور اس کی قوت سے پہلے مسلمان ہوچکے تھے ۔ مسٹر کا لائل کا جواب اس بارے میں نہایت موزون اور دلچسپ ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ

مذہبِ اسلام کا بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کی نسبت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بیشک مذہبِ عیسوی کی نسبت اس امر کا فخر بدرجہا بھلا معلوم دیتا ہے کہ اس کی اشاعت بلاجدال و قتال بذریعہ پند و وعظ بطریق ثبوت وھی ہوئی ۔ تاہم معہذا اس بات کو کسی مذہب کے صدق و کذب کی دلیل گردانا بڑی بھاری غلطی ہے ۔ بیشک شمشیر

نکالو۔ لیکن یہ تبلاؤ کہ شمشیر لوگے کہاں سے ۔؟

محمد صلعم پر جب پہلے وحی نازل ہوئی تو آپ پر فرض ہوگیا کہ تمام مخلوق پر ظاہر کردیں ۔ سب سے پہلے آپ کی صالحہ بیوی حضرتہ خدیجہؓ ایمان لائیں ۔ آپ اس وقت ایمان لائیں ۔ جب کوئی ایمان لانے والا نہ تھا ۔ لہٰذا آپ ان کا احسان کبھی نہیں بھولے ۔ بعد ازاں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ آپ پر ایمان لائے ۔ آپ نے اپنے عقائد کی تلقین ہر ایک شخص کو کی ۔ لیکن بہتوں نے استہزا کیا ۔ اور بعضوں نے بے پروائی کی نگاہ سے دیکھا ۔ میرے خیال میں تین سال کے عرصہ میں صرف تیرہ پیرو ملے ۔ آپ کے اشاعت اسلام کے دل بڑھانے والے سامان ۔ وہی معمولی تحریک اور ترغیب کے وسائل تھے ۔ جو آپ کے ابنائے جنس کو ایسی حالت میں حاصل ہوتے ہیں آپ نے اپنے چالیس رشتہ دار کو مدعو کیا ۔ اور جو آپ کا دعوے تھا کہہ سنایا ۔ دور دور کے آدمیوں میں اعلان کروایا ۔ لوگوں نے یہ خیال کرکے کہ آپ اور ایک سولہ سالہ لڑکا علیؓ (آپکا معاون) تمام دنیا کے خیالات کے برخلاف کیا کوشش کرسکینگے ۔ اس بات کو ایک مضحکہ سمجھا گیا ۔ اور مجمع قہقہہ لگاکر منتشر ہوگیا ۔

حضرت محمدؐ نے جب اہل قریش کو اسلام کی دعوت دی ۔ اور ان کے بتوں کی مذمت کی تو ہر ایک یہ کہہ اٹھا کہ وہ کون ہے جو ہمسے دانا تر ہونیکا دعوے کرتا ہے ۔ اور ہم سب کو محض بیوقوف ، اور لکڑی کے پرستار سمجھکر ملامت کرتا ہے ۔ ابوطالب نے نرمی سے کہا کہ خاموش ہوجاؤ ۔ اور رؤسا کی غضب آوری سے باز آؤ ۔ اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی خطرہ میں نہ ڈالو ۔ مگر آپ نے کہا کہ اگر آفتاب میرے دائیں ہاتھ کی طرف اور ماہتاب بائیں ہاتھ کی طرف کھڑے ہوکر کہیں کہ چپ رہو ۔ تب بھی میں ان کی اطاعت نہیں کرسکتا ۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا ۔ وہ کوئی معمولی اور آسان کام نہ تھا ۔ آپ ہر ایک کو وعظ سناتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ یا علانیہ خطرات ۔ دائمی مخالفت اور نفرت کا آپ شکار بنے رہے ۔ قریش

قریش ہمیشہ غضبناک ہوتے۔ اور سازشوں کے جال پھیلاتے رہے۔ اور حضرت محمدؐ (صلعم) کو اپنے ہاتھوں قتل کرنے کی آپس میں قسمیں کھاتے رہے۔ آپکے رشتہ داروں نے خود مخالفت کی۔ طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ لیکن آپ نے سب کا مقابلہ صبر وشکیب سے کیا۔ اور اپنے کام سے باز نہ آئے۔ آپکی رسالت کے تیرہویں سال میں سب دشمنوں نے جتھا کر لیا۔ اور ہر قبیلہ میں سے ایک ایک منتخب کر کے چالیس آدمیوں سے قسم کھائی۔ اور جان لینے کے انتظار میں تھے! تب آپ نے ہجرت فرمائی۔ اور مدینہ تشریف لے گئے۔

اب خیال کیجئے کہ ایسی شجیع۔ بہادر۔ ہر قسم کی طاقت وجبروت والے اسقدر وحشی اور اتنی بڑی جمعیت کے آگے ایک شخص واحد کا ایک نیا پیغام سنانا۔ ان کے بتوں کو جھٹلانا۔ اور اتنی مصیبتوں کا سامنا صبر سے کرنا کتنی بڑی ہمت کا کام تھا! آپ اکیلے اتنی بڑی جماعت کے مقابلہ میں شمشیر لے کر کیا کرتے۔؟

ایک آدمی کا ایک نئی چیز کا ایجاد کرنا۔ اور تمام دنیا کے مقابلہ میں اسی چیز کا حامی وقائل ہونا۔ اور تلوار اٹھا کر اس کے ذریعہ سے اس چیز کی اشاعت کرنا اسے بہت کم فائدہ دیگا۔ سب سے پہلی تلوار جمعیت ہے۔ اور وہ جمعیت جو تلوار چلانے کے قابل ہو آپ نے اس جمعیت کو کس کی طاقت سے رام کیا۔؟

ہر ایک بات جیسا اس سے ممکن ہوتا ہے۔ خود بخود پھیل جاتی ہے۔ مذہب عیسوی کی نسبت ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا کہ جب اُسے تلوار اٹھانی کی جمعیت ایکدفعہ حاصل ہوگئی تو اس نے اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ سنئے شاہ شارلی میں جرمنی کی شہنشاہی کے بانی نے اپنی تمام عمر مذہب عیسائیت کو بزور شمشیر پھیلانے کے باعث جنگ وجدل میں گذاری۔ اس نے قوم سکین کو وعظ سے عیسائی نہیں بنایا۔ اسی طرح اور رومی بادشاہوں نے بھی کہ اور مذہب کے بت توڑے۔ ان کی کتابیں جلائیں۔ کیا کیا نہ کیا۔

میری رائے میں ہر ایک کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لئے دنیا میں ہاتھ پاؤں مارے۔ خواہ بذریعہ سیف یا بذریعہ زباں یا کسی اور ہتیار کے جو قبضے میں ہو یا میسر آسکے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مدت العمر وہ چیز اس سے فتح نہ ہوسکیگی۔ جو مغلوب ہونے کے لایق ہے۔ اور وہ شئے جو افضل ہو۔ وہ زیادہ ہوگی اور ناقص کو باطل کریگی۔
اللہ تعالیٰ ثالث بالخیر ہے وہ حق کو حق اور ناقص کو باطل کرتا ہے۔

میرے خیال میں اس بیان سے بڑھکر وضاحت کے ساتھ اور اس سے بہتر کوئی قول نہیں ہوسکتا۔ اس میں اس فاضل مورخ نے آنحضرت صلعم کی تبلیغی حالت کا ایک خاکہ کھینچا ہے۔ اور اس سے یہ ثابت کرکے دکھلایا ہے کہ اشاعتِ اسلام میں آپ کو کن کن مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا۔ کیا کیا حالت ہوئی۔ اور اس صورت میں تلوار کیا کام دیتی اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کی اشاعت بجبر تلوار کی طاقت سے نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ اس میں صداقت تھی۔ اس لئے فتح نصیب ہوئی۔ ہم اس کے ثبوت کے لئے اور بیانات بھی ابھی پیش کریں گے۔ اور یہ بھی تبلائینگے کہ دین میں جبر نہیں تھا۔ اور نہ ہے۔

یہاں ان چاروں تبلیغی مذاہب کا باعتبار سلطنت مقابلہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ہم جانتے ہیں کہ شہنشاہیت سوائے تبلیغی مذاہب کے قایم نہیں رہ سکتی کیونکہ وہ لوگ جو تبلیغی مذہب نہیں رکھتے شہنشاہیت قایم کرنے کے نااہل ہیں۔ اس بنا پر کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے مذہب میں شریک کرنا نہیں چاہتے۔
بدھ مذہب تبلیغی مذہب ہے۔ مگر نہ پھیلا پر نہ پھیلا۔ تا آنکہ چندر گپت نے ۳۱۲ سنہ قبل مسیحی۔ اور اس کے جانشین ”اسوکا“ نے بدھ مذہب نہ قبول کیا۔ اور ہندوستان میں یہی دو راجگان ہیں جنہوں نے شہنشاہیت قایم کی تھی۔

مسیحیت نے اسوقت زور پکڑا اور پر و بال نکالے۔ جب چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب قبول کر کے اسے بزور شمشیر پھیلایا۔

زرتشت ناکام رہتا اگر دارا گشتاسپ نے اس پر ایمان لا کر تلوار کے زور سے آتش پرستی نہ پھیلائی۔

اسلام کے بانی یتیم تھے۔ بے کس تھے۔ بے یار و مددگار تھے اور تمام روئے زمین پر شرک اور بُت پرستی کا تسلط تھا۔ اور وہی بادشاہ بنے۔ اور اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر بقول گبن "دنیا نے نہ کبھی پہلے دیکھی۔ اور نہ آئندہ دیکھیگی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ باقی تینوں مذاہب اپنی اشاعت میں بادشاہوں کے ممنون ہیں۔ مگر اسلام ہے کہ خود اپنے فطری۔ اور طبعی صداقت کی وجہ سے جس نے مسلم اوّل کو بادشاہ بنایا۔ پھلا پھولا بڑھا۔ اور تا قیامت بڑھتا رہیگا وہ اپنی اشاعت میں بادشاہوں کا محتاج نہیں۔ بلکہ خود بادشاہ بنانے والا ہے۔" وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ:

ایک خدا کے ماننے والوں سے کہا گیا کہ اے اہل کتاب ہم ایک کلمے پر جو تمہارے اور ہمارے ہاں یکساں ہیں۔ متفق ہو جائیں کہ ہم ایک خدا کی پرستش کریں۔ اور اسکا کوئی شریک نہ ٹھیرائیں۔ اور یہ کہ ہم میں کوئی کسی کو رب نہ قرار دے۔ کافروں تک کو سورہ کافرون میں کہا گیا " لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ"۔ سورہ کافرون رواداری کی اعلیٰ مثال ہے۔

اسلام شرک سے سخت بیزار ہے۔ مگر ارشاد ہے کہ "مسلمانو تم مشرکوں کے بتوں کو برا نہ کہو۔ وہ تمہارے معبود کو برا کہینگے"۔ مشرکوں سے بھی حسن سلوک کی ہدایت ہے۔ تیرے والدین اگر مشرک ہیں۔ تاہم ان کی اطاعت کر۔ لیکن اگر وہ تجھے مشرک

بنانا چاہیں تو ان کی اطاعت نہ کرو۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ دین میں اکراہ نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے متمیز ہو گئی۔ یہ مدنی ارشاد ہے۔ جب تسلط اسلام قایم ہو چکا تھا تو کسی کو جبراً مسلمان نہ بنانے کا حکم ہوا۔ صداقت اپنی اصلی جوہر کی وجہ سے ممتاز نظر آئیگی۔

نجات عام۔ اور دین وسیع ہے۔ نجات کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص نہیں مسلمان۔ یہودی۔ نصرانی۔ وغیرہ جو خدا۔ اور قیامت پر ایمان پر لائے۔ اور اعمال نیک کئے وہ نجات پائیں گے۔

یہ تھی تلوار اسلام کی جس کی وجہ سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔

اسلام میں تعصبات ملکی۔ حسبی۔ نسبی۔ علمی۔ و معاشی کچھ بھی نہیں۔ اور ان ہی اخلاق کی وجہ اسلام پھیلا۔ اسلام کے سر جو شمشیر سے پھیلائے جانے کا الزام تھوپا گیا ہے۔ تو ہم پوچھتے ہیں کہ چنگیز خانی کیوں مسلمان ہو گئے۔ چین میں جہاں مسلمانوں نے ایک دن بھی حکومت نہیں کی آج چھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ وہاں کیوں آج ساری دنیا سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اسکا جواب واقعات کی روشنی میں سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ وہ شمشیر تھی عدالت و انصاف کی صداقت و راستبازی کی اور اس اعلیٰ و ارفع نظام اخلاق کی جو اعمال کے ذریعہ لوں کو آناً فاناً مسخر کر لیتا ہے۔ اسکا ثبوت ایک یورپین ہی کی زبانی سن لیجئے۔

مسز اینی بسنٹ لکھتی ہیں کہ "جب حضرت ہجرت کر کے مدینہ پہنچے ہیں وہاں لوگ بڑے تپاک سے پیش آتے ہیں لیکن آپکے دشمن آپکا تعاقب کرتے ہیں۔ حضرت کے رفقا کی تعداد بہت کم ہے اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ۔ بالآخر لڑائی ہوتی ہے اور جہاں دونوں ملتے ہیں "یہ جنگ بدر" ہے پیغمبر چلا کر کہتے ہیں کہ اے خدا اگر یہ چھوٹا سا گروہ تباہ ہو گیا پھر تیری سچی پرستش کرنیوالا کوئی باقی نہ رہیگا۔ لڑائی گھمسان ہوتی ہے اور حضرت کی فتح ہو جاتی ہے۔ کیا بات تھی کہ اتنی چھوٹی سی جمعیت اتنے کثیر لشکر کے مقابلہ میں فتح پائی ہے۔؟

یہ خدائی امداد تھی۔ اور صداقت کو ہمیشہ کامیابی ہوتی ہے۔ یہی آپکی پہلی جنگ تھی۔ یعنی حملہ کی مدافعت کرنا جنگ بدر کے بعد قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک تھا؟ حضرت کے حکم کی وجہ غایت درجے کی مہربانی کا سلوک کیا گیا۔ مسلمان انہیں روٹی دیتے تھے۔ اور اپنے لئے صرف کھجوریں رکھتے تھے۔ کیا اس زمانے کی کسی جنگ کے بعد دشمن کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ؟ یہی وہ اخلاق تھے جس کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی :۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی اشاعت کا باعث کیا تھا اب ہم یہ بتلائینگے کہ اسلام نے اگر شمشیر اٹھائی بھی تو کب اور اسکی کیسی ضرورت ہوئی۔؟

شمشیر کی ضرورت مسلمانوں کیلئے مشرکین ملّہ کے دائرہ ظلم وستم نے جب غیر محدود وسعت اختیار کی تو حضرت نے ناچار پیروان اسلام کو حبشہ کی طرف چلے جانیکا حکم دیا۔ پھر مکہ سے تین سو میل کے فاصلے پر مدینہ ہجرت کرنا مناسب سمجھا تاکہ جنگ و جدل کی نوبت پہنچنے کے بغیر مخالفوں کی ایذا سے نجات ملے۔ لیکن ان لوگوں کو مدینے میں بھی اسلام کا پھلنا پھولنا گوارا نہ ہوا۔ بلکہ مدینہ پر فوج کشی کردی۔ اب مسلمانوں کے مصائب کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور دشمنوں کی تعدی بے حد بڑھ گئی تھی۔ ناچار ان کو بھی تلوار اٹھانی پڑی۔ اور وہ بھی جارحانہ نہیں۔ بلکہ مدافعانہ ارادے سے۔ کشورکشائی یا انتقام کے لئے نہیں۔ بلکہ دین کی حمایت کے لئے۔ اور جنگ میں بھی ان کو زیادتی۔ اور سختی کی ممانعت کی گئی تھی۔

اب موقع ایسی مجبوری کا تھا کہ اسلام کو تلوار ہاتھ میں لئے بغیر چارہ نہ تھا۔ ورنہ مسلمان مخالفوں کی ٹھوکروں سے پامال ہو جاتے۔ مدینہ و مساجد تباہ ہو جاتے۔ اور اسلام کا نام تک مٹ جاتا۔

اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے۔

ان کو مسلمان بنانا نہایت غرض سے انہیں چھوڑ دیا جاتا۔ دین و ایمان کا تعلق دل سے ہے نہ کہ جبر و تشدد سے۔ اور کسی فاتح کی شمشیر میں یہ طاقت نہیں کہ کسی کے دل میں نور ایمان پیدا کر دے۔ اشاعت اسلام کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اسلام کی حقیقت کی خبر نہیں ان کو زبانی رہنمائی کی جائے۔ اگر ان کے نصیب میں ہے مانیں ورنہ بدقسمتی۔ اور یہی پیغمبرانہ اشاعت اسلام تھی۔ ہاں جب مخالفین نے اسلام کے نام و نشان کو مٹانا چاہا۔ اور یہ چاہا کہ دین اسلام کو تلوار سے کام لینا پڑا۔ کہ اسلام زندہ رہے۔

مذہب اسلام کے اس قدر جلد پھیل جانے کی وجہ متعصبین یورپ نے اور ایک گھڑ لی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام چونکہ خواہشات نفسانی سے زیادہ نہیں روکتا۔ اور اس کی اخلاقی تعلیم گری ہوئی ہے۔ اس لیے لوگوں میں عام طور سے اس کی رغبت پیدا ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی جماعت بڑھ گئی۔ اس کے جواب میں مسٹر لین پول یورپ کے ایک فاضل مورخ کا قول ملاحظہ ہو وہ کہتے ہیں "دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اپنی اخلاقی کمزوری اور رعایت خواہشات کے ساتھ اس قدر دیرپا ثابت ہو۔ اور لوگوں کی روحوں پر اقتدار حاصل کرے!"

وہ مورخین جو زیادہ معقول پسند ہیں اس کا سبب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جس وقت عرب میں ظہور اسلام ہوا۔ اُس وقت کوئی قوت مقابل میں موجود نہ تھی۔ کیونکہ عیسویت اور یہودیت دونوں خرابی کی انتہائی منزلوں سے گزر رہی تھیں۔ اور ان میں دنیاوی قوت ایسی نہ تھی جو اس سیلاب کو روک سکیں۔ بیشک ترقی اسلام کے لیے یہ ایک سبب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن صرف اسی پر انحصار کر دینا خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ بقول لین پول صاحب اس سبب کے ساتھ خود مذہب اسلام کی تعلیمات پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ جو حقیقی راز عروج اسلام کا تھا۔ اگر مذہب اسلام کی اشاعت پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ سرعت برق کے ساتھ سرزمین عرب سے نمودار ہو کر۔ شام

فارس ۔ مصر ۔ شمالی افریقہ ۔ اور سپین میں پھیل گیا ۔ اور سوائے اسپین کے وہ آجتک کسی ملک سے منقطع نہیں ہوا ۔ جہاں اس نے ایک بار قدم جما لئے ۔ اور اگر اسی کے ساتھ ہندوستان ۔ چین ۔ افریقہ ۔ وغیرہ کو شامل کر لیا جائے ۔ تو کیا ایک شخص کے لئے یہ مقام حیرت نہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کے مذہب کو اس قدر ہمہ گیر ۔ اور پائدار دیکھتا ہے ۔

اسلام کی تبلیغ کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ براعظم ایشیا ۔ براعظم یورپ براعظم افریقہ ۔ جن میں لاکھوں شہر قصبہ گاؤں اور بستیاں بستی ہیں ۔ اور جزیرے بھی ہیں ۔ مثلاً مالدیپ ۔ سماٹرہ ۔ جاوا ۔ بورنیو ۔ سیلیبیز ۔ فلپائن ۔ نیوگنی ۔ اور ان کے علاوہ بعض جزیرے ۔ جیسے ملایا ۔ وغیرہ میں اسلام پہونچ گیا ۔ بیشمار مسلمان ملتے ہیں ۔ اور تیرہ سو برس سے آجتک ہمارے مذہب میں اشاعت جاری ہے ۔ اس وقت تمام روئے زمین پر چالیس کروڑ مسلمان اپنے ایمان کو زندہ رکھنے والے ۔ اس کے حکم پر لبیک کہنے والے موجود ہیں ۔

مسٹر ولفرڈ اسکاون بلنٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ۔[1]

میں نے جدہ میں حج کے موسم پر قیام کیا ۔ اور دیکھا کہ ہر قوم کے مسلمان لوگ موجود ہیں ۔ ہندوستان کے لوگ ۔ افریقہ کے مور لوگ ۔ بانیلز کے حبشی ۔ جاوا ملایار ۔ یا سمنا کے خوانین کے تاتاری ۔ فرانسیسی مقبوضات کے عرب ۔ عمان زنجبار کے لوگ ۔ چینیوں کے لباس میں بھی مسلمان ہوتے ہیں ۔ اور چین کے بھی مسلمان نظر آتے ہیں ۔ جب یہ خلقت گلیوں میں پھرتی نظر آتی ہے تو دیکھنے والے کی نظر میں اسلام کا اندازہ وسیع ہو جاتا ہے ۔ اور جیسا کہ

مسٹر ٹامس براون صاحب کا قول ہے ۔ وہ اپنے دل میں یہ کہہ اٹھتا ہے کہ کچھ

---

[1] فیوچر آف اسلام ۔

شک نہیں کہ مسلمانوں کے دنیا کے حدود ان حدود سے وسیع تر ہیں جو مؤلفان جغرافیہ نے قائم و تجویز کئے ہیں۔

حدیوں، ذمیوں، اور معاہدین سے متعلق جو عادلانہ اور روادارانہ قواعد وضع کئے گئے ہیں۔ ان کی قرآن کریم میں جا بجا تصریح کی گئی ہے۔

حربیوں کے متعلق مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر وہ تم پر چڑھ آئیں تو مدافعانہ پہلو اختیار کرو۔ اگر وہ حملے کے مرتکب ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ لڑو۔ مگر کسی حال میں حد سے تجاوز نہ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ خدا تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے سے نہیں روکتا۔ جو تمہارے خلاف لڑائی نہیں لڑتے۔ اور یہ کہ قرآن کے ساتھ انصاف کرو۔ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان سے منع کرتا ہے۔ جو تمہارے ساتھ مذہبی لڑائی لڑیں۔ اور جو تم کو تمہارے گھروں سے نکال دیں۔

مدافعانہ جہاد کی اجازت ہے۔ اور وہ تین صورتوں میں جائز رکھا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ مخالفین تم پر چڑھ آئیں۔ دوم یہ کہ تم کو اپنے وطن سے نکال دیں۔ سوم یہ کہ اس قوم پر چڑھ آئیں جو تمہاری حلیف ہے۔ اور ان تینوں صورتوں میں بھی یہودیوں کے معابد، عیسائیوں کے گرجا۔ اور دیگر اقوام کے عبادت خانے، اور اسلامیوں کی مسجدوں کی حفاظت کو ضروری قرار دیا ہے۔

غرض یہ اسلام کی تعلیم تھی۔ اور تلوار اٹھانے کا حکم بھی ہوا تو گویا ایک آخری چارہ کار۔ اور ایسی اشد صورت میں۔

دیکھئے سردار دو عالم نے جب تبلیغ شروع کی دنیا میں شرک بے حد تھا۔ آپ کی دعوت پر چند سابقین نے اسلام قبول کیا۔ اس کیفیت کو ہم نے واضح طور پر اس کے

آئینگے۔ اسلام کی تلوار اور یہ تلوار ہمیشہ تیز ہے۔ اور بغیر خون بہانے کے لوگوں کو تہ تیغ کر دیتی ہے۔ یہی اسلام کا بڑا جوہر ہے۔ اور یہ خدا کا بڑا امر ہے۔ اور ایک دفعہ جب کوئی اسلام کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے پھر دین و دنیا دونوں کی فلاح حاصل ہوتی ہے اور وہ سعادتمند بن جاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کی خوبی۔

ہم اسی موضوع کے تحت میں ایک اور اعتراض بیان کریں گے۔ پھر دوسری باتوں کی طرف رجوع ہوں گے۔

بعض یورپین مؤرخین کا اور ایک اعتراض یہ ہے کہ دین اسلام صرف عرب ہی کے لئے تھا۔ اور پیغمبرؐ نے وہیں اس کی اشاعت کی۔ یہ غلط خیال ہے۔ دین اسلام کسی خاص ملک یا قوم کے لئے نہ تھا۔ اور صرف خاص آدمیوں کیلئے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ عیسائیت میں یہ بات ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں حضرت مسیح کے بیان سے خود ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰ خود فرماتے رہے کہ میں بنی اسرائیل کی بھولی بھٹکی بھیڑوں کو راستہ بتلانے آیا ہوں۔ چنانچہ اسی کی ہدایت میں لگے رہے۔ لیکن آنحضرت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں بنی اسمٰعیلؑ کی ہدایت کے لئے آیا ہوں۔ انہوں نے بنی اسرائیل و اسمٰعیل سب کو ایک آنکھ سے دیکھا۔ بلکہ انہیں اور تمام دنیا کو اپنا بھائی سمجھا۔ آپ نے سب کو یکساں محبت و دردمندی سے پیغام حق سنایا۔ اور جس آزادی سے ادنیٰ اور غریب آدمیوں کو صداقت کی طرف بلاتے تھے۔ اس آزادی سے بے دھڑک عظیم الشان بادشاہوں کو پیغام حق بھیجتے رہے۔ بادشاہوں کی شان وشکوہ کا رعب بھی اُن کو پیغام حق سُنانے سے مانع نہیں ہوتا تھا۔ جسطرح آپ نے چند مسافران یثرب کو پیغام حق سنایا۔ اسی طرح شاہان روئے زمین کی طرف پیغام ہدایت بھیجا۔ آپ نے ایران کے مغرور و بد دماغ فرماں روا خسرو کے پاس پیغام بھیجا۔ سلطنت رُومہ کے عظیم الشان بادشاہ ہرقل اعظم کو بھی دعوت اسلام دی۔ اسی طرح اوروں کو بھی راہ حق کی طرف بلایا۔ غرض آپ نے تبلیغ حق کل روئے زمین پر کی۔ صرف عرب

ہی کو آپ نے اپنا پیغام نہیں سنایا۔ اس بیان سے یہ اعتراض بھی صاف ہو جاتا ہے۔

اسلام اور عورت

بعض مغربی مورخین بلکہ اکثر یورپ والوں کا اسلام پر بڑا الزام یہ ہے کہ اس مذہب میں عورتوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اور عورتوں کی تمدنی عزت کو بالکل نہیں کیا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ کتنا لغو اعتراض ہے۔

اب ہم بتائیں گے کہ اسلام کے پہلے عورتوں کی کیا حالت تھی اور یورپ کا خود اس بارے میں ایک زمانہ تک کیا حال رہا اور اسلام ہی وہ پہلا مذہب تھا جس نے عورتوں کی حالت درست کی۔ اور اون کو جائز آزادی عطا کی۔ اور آج اسلام کے اصول پر یورپ نے بھی عورتوں کو آزادی دی۔ مگر کس درجے کی اور اس کے نتائج کیا ظہور میں آرہے ہیں۔ اس کا ذکر بھی ہم آگے چلکر کریں گے۔

اس مفروضہ اعتراض کا جواب کہ اسلام میں عورت کو آزادی نہیں دی گئی۔ اور جانوروں کا سلوک روا رکھا گیا۔ ہم یورپ والوں کی زبان سے ہی دیں گے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح اس امر کا اقبال کرتے ہیں کہ اسلام ہی نے پہلے پہل عورتوں کی حالت درست کی۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں عورتوں کا کیا مرتبہ تھا۔ بغیر کسی تعیین کے تعداد ازدواج ہر جگہ جائز تھا۔ طلاق دینا شادی کرنا نہایت معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ حیات منزلی میں عورت کا مرتبہ ایک جانور سے زیادہ نہ تھا۔ دختر کشی کا عام رواج تھا۔ غرض عورت کا کوئی مرتبہ ہی نہ تھا۔ اب دیکھئے اس کی اصلاح کیسے ہوئی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فوراً محسوس کیا۔ اور عزم راسخ کیا کہ اس طبقہ کی حالت درست کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر آپ سختی سے کام لیتے تو عورت

کی معاشرتی حالت کو دیکھتے۔ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ آپ نے دیکھا کہ سب سے زیادہ ان کی نجات کی ایک راہ متعین کرنا ہے۔ وہ دختر کشی کے رواج کو بند کرنا۔ چنانچہ [illegible] آپ کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں عورت کی عزت پیدا کرنے کا خیال تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس سے متعلق آپ کے کس قدر اقوال موجود ہیں۔ خود آپ نے اپنی ذات سے۔ اعمال سے طرز معاشرت سے جیسا بہترین نمونہ معاشرت ازدواج کا پیش کیا۔ وہ دنیا سے مخفی نہیں۔

قرآن کریم میں یہاں تک ارشاد باری ہوا۔ (سورۂ بقرہ۔ رکوع نمبر ۲۸ میں ارشاد)

"عورتوں کے شوہروں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے شوہروں کے عورتوں پر۔ ہاں مردوں کو ان پر درجہ ہے۔" اس سے عورتوں اور مردوں کا ہم مرتبہ بنا دیا گیا اور دونوں کے حقوق یکساں کر دیے گئے (آئندہ چل کر سورۂ نسا، رکوع نمبر ۳ میں فرمایا ہے۔

"اور بیویوں کے ساتھ حسن سلوک سے رہو۔ اور جس کو بیوی ناپسند ہو تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو۔ اور اللہ تم کو بہت ہی خیر و برکت دے" فرمائیے عورتوں کو اس سے زیادہ کیا حقوق دیئے جا سکتے ہیں۔ یعنی اگر عورت میں کچھ عیب بھی ہو تو کتاب سماوی اس کے خاوند کو نصیحت کرتی ہے کہ ایسی عورت کو علیحدہ نہ کیا جائے۔

یورپ میں عورت کی کیا حالت تھی۔ جب دنیا میں مسیحیت پھیلی۔ ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی پھیل گیا کہ حضرت آدمؑ نے "درخت علم کا پھل کھایا۔ اور حضرت حواؑ نے کھلایا۔ اور جنت سے نکالے گئے۔ پھر کیا تھا عورتیں بے روح تصور کی گئیں۔ اور علم کی سخت ممانعت۔ سولہویں صدی کے آغاز تک اسی عقیدہ پر عملدرآمد رہا۔ تاآنکہ لوتھر کی اصلاح شروع ہوئی۔ بہت سے علما، حکما، اور فلاسفر قتل کیے گئے
اسلام آیا اور اپنے ساتھ تعلیم لایا۔ "طَلَبُ العِلمِ فَرِیضَةٌ عَلیٰ کُلِّ مُسلِمٍ وَّمُسلِمَةٍ

باتّباعِ یونان "روما" میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ وہ شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ جو مال پیدا کرے شوہر کا سمجھا جاتا تھا۔ نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتی تھی۔ نہ ضمانت نہ معاہدہ۔ نہ وصیت۔ اور نہ ادائی شہادت۔

باتّباعِ "رومن لا"۔ یورپ میں آجتک عورت کی کوئی علیحدہ شخصیت تسلیم نہیں کی گئی۔ باپ کے ہاں "مس"۔ اور شوہر کے ہاں "مسِس" کھلاتی ہے۔ اس کا اپنا نام باپ یا شوہر کے تعلقات میں باقی نہیں رہتا۔

۵۸۶ء میں جب حضورؐ کی عمر سولہ سال کی ہوئی عیسائی دنیا میں یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ آیا عورت میں روح ہے کہ نہیں۔ ایک کونسل منعقد ہوئی۔ جس میں سارے علماء و فضلاء اکھٹے ہوئے۔ بڑے بحث اور مباحثہ کے بعد کثرتِ رائے کے باعث یہ طے پایا کہ، عورت میں روح ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بے روح تصور کیجاتی تھی۔"

خود مسیحؑ نے اپنی ماں سے کیا کہا۔؟ یہ کہ اے عورت مجھے اب تجھ سے کیا کام ہے۔ اور آجتک یورپ میں یہی حال ہے۔ مگر اسلام نے ماں کی عزت کس طرح کی۔؟ کہا گیا ہے۔ کہ جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ یعنی جتنی خدمت اور عزّت ماں کی کروگے اتنی ہی آخرت کی بھلائی ہوگی۔

عیسائیوں کو عورت کے متعلق سلوک جو کچھ بھی سیکھنا پڑا وہ اسلام ہی سے اس لئے کہ ان کا مذہب اس سے معذور ہے۔ نہ ان کی مقدس کتاب میں کوئی اس کے متعلق ذکر ہے۔ اور نہ اس کے بانی مذہب کی سیرت سے کوئی بات مل سکتی ہے۔ بلکہ خود بانی نے کیا سلوک اپنی ماں کے ساتھ کیا وہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اس بارے میں توجہ کرتے اور نہ انہوں نے اپنی عملی زندگی سے کوئی مثال پیش کی۔ مگر اسلام کے بانی نے نہ صرف تعلیم دی۔ اور اس امر کی اصلاح کی۔ بلکہ خود عورتوں کے شوہر بنے۔ اور اپنی تعلیم کو عملی جامہ

پھنا کر دنیا کے سامنے پیش کرو کہا یا کہ عورت کی یہ عزت ہوتی ہے۔ یہ حقوق ہیں۔ اور اسطرح سلوک کیا جائے۔ اس کی مثال عیسائیت میں کہیں نہیں ملیگی۔ اسی بارے میں ہم اب ان یورپین مورخین کے اقوال پیش کریں گے۔ جس میں انہوں نے یہ اقبال کیا ہے کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب تھا جس نے عورت کی حالت درست کی۔

موسیو ما لتھا لیسمی سلینٹ ہیلیر۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے۔

"اسلام نے عورتوں کی حالت کی بہت اصلاح کی ہے۔ اور یہی وہ مذہب ہے جس نے ایسا کیا ہے۔۔ بہت آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے کہ کل اور مذاہب۔ اور اقوام میں جو عربوں سے پہلے تھیں۔ عورتوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔"

موسیو لیبان۔ اسی قبیل کا مورخ رقمطراز ہے:

"یہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے۔ جس نے عورتوں کی حالت کو درست کیا۔ اور چونکہ مشرق میں۔ بمقابلہ یورپ کے عورت ہمیشہ معزز اور محترم رہی۔ تعلیم اور تربیت میں بھی وہ مغربی بہنوں سے زیادہ فائق ہے۔ تمدنِ اسلام میں عورتوں کو بالکل وہی مرتبہ دیا گیا ہے۔ جو انہیں بہت دنوں بعد یورپ میں حاصل ہونیوالا تھا۔ اہلِ یورپ میں سپاہیانہ اخلاق۔ جس کا بڑا جز عورتوں کا برتاؤ تھا۔ عربوں سے آیا۔ اور وہ عیسائی مذہب نہ تھا۔ بلکہ اسلام تھا۔ جس نے اس وقت عورتوں کو ان گری ہوئی حالت سے ترقی دے۔"

غرض اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق دے کہ مردوں کے مدِمقابل کر دیا۔

ہم نے یہ پہلے کہ آگے بیان کیا ہے یورپ نے بھی یہی تعلیم اسلام سے حاصل کی۔ لیکن اسلام سے زیادہ آزادی انہوں نے دی۔ اور بے باک کر دیا۔ جس کا نتیجہ بے پردگی بے حجابی نوجوان بے شرمی اور بے عصمتی کا ہونا۔ ناگزیر تھا۔ اہلِ یورپ کا مقصود یہ ہے کہ عورتوں کو بالکل اس طرح سے آزاد کر دیا جائے۔ جس طرح آج۔ مدعیانِ تہذیب کے ہاں پایا جاتا ہے

لیکن اس کے جواب میں بھی زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس آزادی کا نتیجہ اس وقت ممالک یورپ میں رونما ہو رہا ہے۔ اس سے ہر ذی فہم آدمی پناہ مانگتا ہے۔

حیاتِ منزلی کا دلکش ترین منظر یہ ہے کہ وہاں عورت حکمراں نظر آئے۔ یعنی بچوں کی تربیت۔ انتظامِ خانہ داری۔ مرد کی آرام و آسایش کا اہتمام اس کے ہاتھوں سے انجام پائے۔

پھر اب دیکھئے کہ یہ منظر صحیح معنوں میں کہاں نظر آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے جواب میں۔ یورپ کا نام لے سکتا ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے تہذیب منزلی نام رکھا ہے صرف بے حیائی اور بے غیرتی کا۔ کیونکہ آج یورپ میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو اپنے بچوں کی پرورش صحیح معنوں میں کرتی۔ یا واقعی طور سے اپنے شوہر کے آرام و آسایش کی قدر رکھتی ہو۔

اگر اسلام بھی عورتوں کو اسی حد تک آزاد کر دیتا تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ آج مسلمانوں کی عورتیں بھی ایسی بے باک نظر آتیں۔ اور اپنی نسائیت کو تباہ کر کے، مسلمانوں کے لئے عذاب جان نہ ہو جاتیں۔

مغربی بہترین عورت وہ ہو گئی۔ جس کے حسنِ گفتار۔ حسنِ رفتار۔ حسنِ صورت باکمال رقص کے کارنامے منظر عام پر نمایاں ہوں۔ جس کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوں۔ جس کا تذکرہ لوگوں کے مجمعوں۔ اور غلغلہ انجمنوں میں بلند ہو۔ اور جس کی نفاست۔ شائستگی۔ دلربائی کے شور عالم میں بلند ہوں۔

اس مغربیت کا اثر مسلمانوں میں بھی ہوتا جاتا ہے۔ اور اسلام کی عورت جو گھر کی اندرونی زندگی کی مالک ہو۔ خانہ داری کا اچھا سلیقہ رکھتی ہو۔ بچپن میں والدین کی مطیع۔ نکاح کے بعد شوہر کی خوشنودی کو پروانۂ جنت خیال کرتی ہو۔ ان اصولوں کو۔ ترک کیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کی دلفریب حیا سوز تعلیم مروج ہوتی جا رہی ہے۔ اسکو

تغیر مولانا اکبر الہ آبادی نے حسب ذیل اشعار میں خوب فرمائی ہے۔

حامدہ چمکی ۔ نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی ✤ اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

آرام بڑھ گیا ہے۔ اعزاز گھٹ گیا ہے ✤ خدمت میں ہے وہ لیڈی اور ناچنے کو ریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر ۔ ✤ شوہر پرست بیوی ۔ پبلک پسند لیڈی

یہ ہے یورپ کا فیض ۔ اور اسلام کے احسان کا بدلہ ۔ اسی قسم کی اور بہت ساری باتیں ایسی ہی ہیں ۔ مگر ہم مضمون کی طوالت کی وجہ سے اختصار سے کام لیتے ہیں ۔ یورپ کا ایک اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے احسانات کا اعتراف کرتے ۔ مگر بتاؤ آج کتنے یورپین مؤرخین ہیں جو بے تعصبی سے علانیہ اعتراف کرتے ہیں ۔ اور اسلام کے ہمہ گیر احسانوں کو مانتے ہیں ۔ مگر ہم یہ انصاف سے کہیں گے کہ بعض اس سے مستثنیٰ ہستیاں ہیں ۔ جنہوں نے نہایت آزادی ۔ اور بے باکی سے مسلمانوں کے احسانات کا اعتراف کیا ہے ۔ اور یہ وہی ہیں جن کے اقوال ہمنے اوپر پیش کئے ہیں ۔ اسی ضمن میں ہم اور چند باتیں بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں ۔ جن کا تعلق اسی بحث کے ساتھ ہے ۔

تعداد ازدواج کا مسئلہ جس کی اجازت اسلام میں بصورت ضرورت دیگئی ہے مغربی تہذیب اسے ہر حال میں نا جائز قرار دیتی ہے ۔ بلکہ اسے سخت نفرت کی نظر سے دیکھ رہی ہے ۔ لیکن آج یورپ کے بڑے عالید ماغ مدبروں کو تسلیم کر لینا پڑا ہے کہ درحقیقت اسلام اس کے جواز میں حق بجانب ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی لڑائیوں کی وجہ مردوں کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے ۔ اور عورتوں کا پلہ بھاری ہو گیا ہے ۔ مسیحیت میں اس تعلیم کے نہ ہونے سے آج کتنا نقصان واقع ہو رہا ہے ۔ ایک ایک مرد کے ساتھ چار چار عورتیں ! دعوتوں میں جلسوں وغیرہ میں ہوتی ہیں ۔ اور تعلقات زناشوئی کا کوئی تعین ہی نہیں ۔ اس کے نتیجے اولاد حرام ہوتے ہیں) ۔ اور یتیم خانہ آباد ،

ہیں۔ آجتک ان کے ماں باپ کا پتہ نہیں چلتا۔

اس کی بجائے اس پاک تعلیم پر عمل کر کے کیوں نہیں حلال طریقے پر وہی چار بیویاں کرتے اور اولاد صالحہ اور حلال نہ ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس اسلامی اصول مصلحت آمیز پر یورپ نفرت کرتا تھا۔ آج پوشیدہ طور پر اس پر عمل پیرا ہے۔ اور اب تو ضرورت وقت، اور ناگزیر واقعات نے یورپ کو گویا اس تعلیم پر کاربند ہونے کا حاجتمند بھی بنا دیا ہے۔ اور عجب نہیں کہ وہ اس تعلیم پر آئندہ عمل کرنے کے لئے مجبور ہی ہو جائے

اسی طرح "مسئلہ طلاق" بھی ہے۔ جو پہلے مغربی تہذیب، اور مسیحی، مذہب کی نگاہوں میں نہایت ذلیل تھا۔ مگر اب شادی شدہ عورتوں کے تعلقات زناشوئی کے خاص خاص حالات میں ایک ضروری، اور آخری چارہ کار مان لینا پڑا پڑا ہے۔

یہی حال پردے کا سمجھ لو۔ یورپ والے رفتہ رفتہ سمجھتے، اور اقرار کرتے جاتے ہیں کہ اصل اسلامی پردہ جسے کھنا چاہئے وہ درحقیقت ایک مہذب سوسائٹی کے امن وعافیت کے لئے ناگزیر ہے۔ اور سچی شرافت نیز انسان کی فطری عزت اسے اٹھانے کی اجازت نہ دے گی۔ اور نہ دے ہی سکتی ہے۔ یہاں تک کہ مغربی تمدن کی تمام شرمناک بدعنوانیاں جو اس تقلید یورپ سے اس وقت بعض اسلامی، ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ محض اسلامی پردے کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

ان چند باتوں کے علاوہ جو سرسری طور پر بیان ہوئیں۔ اور جن کا زیادہ تر تعلق تمدن۔ یا معاشرت سے ہے۔ اور بھی بہت ساری باتیں ہیں۔ جو نوع انسان کی دینی رہنمائی، اور آخرت کی بھلائی سے علاقہ رکھتی۔ اور جن کو اسلام بطور عقائد صحیحہ کے پیش کر کے۔ اُن کی صداقت ومعقولیت کے کھلے کھلے ثبوت بھی دیتا، ہے۔ دنیا مان۔ اپنی کوتاہی کو، مگر مادی وعارفی ترقیات پر فخر کرنیوالی مغربی دنیا

اتک ان کو حقیر سمجھتی رہی۔ لیکن اسوقت قادر و قہار کی زبردست مشیت اس کی گردن پکڑ کر اسلام کے حضور جھکاتی ہے۔ مثلاً حضرت مسیح کی خدائی کا خیال خام احرار یورپ کے دلوں سے نکلگیا۔ صلیب پرستی کا طلسم ان کے دلوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ کفارہ کی حقیقت واقعہ صلیب کی چشم دید شہادت نے آشکار کردی۔ تثلیث کی بھول بھلیاں۔ اب ان کے نزدیک ایک لایعنی معمّا رہ گئی ہیں۔ آنحضرتؐ کو مسیحی دنیا کا ایک بڑا حصّہ صدیوں تک معاذ اللہ ڈاکو۔ اور خدا جانے کیا کیا کہتا رہا۔ مگر اب یہی نہیں کہ اس کے بہت سے علم دوست محقق انصاف پسند اور بے تعصب ازاد آپ کو صرف ایک عظیم الشان انسان۔ یا مقنن مانتے ہوں۔ بلکہ خود مسیح علیہ السلام کے مقابلے میں۔ حضور کو ایک زبردست پیشوا۔ ایک مصلح ربانی اور ایک کامیاب بانی دین وملت تسلیم کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں جسے انہوں نے علمی رنگ میں معمولی طور پر قبول کیا۔ بلکہ بفضلہ آپ کی پاک تعلیم کے تحقیق کے بعد فریفتہ ہو کر کھلم کھلا بخوشی آپ کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈال رہے ہیں۔ اور یہاں تک صدق واخلاص دکھلاتے ہیں کہ۔ قوم۔ سوسائٹی۔ خویش واقربا۔ کی طرف سے۔ خواہ کیسی ہی مشکلات ومصائب پیش آئیں۔ پروا نہیں کرتے۔ کیا یہ اسلام کی بیّن فتح نہیں۔؟

اسلام کی مقبولیت کا کہانتک اندازہ لگائیں۔ دیکھئے اور ایک بات ہے۔ اسلام نے شراب کو حرام کیا۔ مغربی تہذیب اور مذہب عیسوئیت نے اس کو جائز رکھا۔ ایک مدت تک اس پاک تعلیم کی ہنسی اڑاتی رہی۔ مگر آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے ڈنڈے کے زور سے اس تعلیم کی معقولیت اور خوبی منوا کے چھوڑی۔

شراب خواری کے نتائج آج یورپ میں جو ظہور پذیر ہیں وہ پوشیدہ نہیں۔ دوسری بات ہے کہ اس تہذیب کے سارے کے سارے متوالے ہمیشہ ہمیشہ اس دشمن

جان و ایمان سے تائب ہوں یا نہ ہوں بچے رہیں یا نہ رہیں

اسلام نے سود کو ناجائز ٹھیرایا ہے۔ اور مغربی آئین تمدن اسکو ترقی اور فروغ تجارت کا ایسا لازمی ذریعہ بتاتا ہے کہ اسکے بغیر ایک دن کام نہیں چلسکتا لیکن چندہی سال گذرے کہ صدہا بنکوں کے دیوالے دھڑا دھڑ نکلے اور یہ ثابت کر گئے کہ سود کو نفع کھنا ایک من سمجھوتی بات ہے ورنہ اسکا اصل انجام گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ غرض یہ ہیں اسلامی **اصول** جنکی مقبولیت پر یورپ آج گردن جھکا رہا ہے :۔

اسلام پر اور ایک الزام یورپین مورخوں نے لگایا ہے کہ اسمیں لونڈی، غلاموں کا رواج دیا گیا ہے۔ اور اون کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ اب ہم اس اعتراض پر بحث کریں گے۔ اور ان یورپین مورخین کی زبانی ہی اس بات کا ثبوت دیں گے کہ اسلام نے غلامی کے پوزیشن کو کسقدر بلند کیا۔

اسلام اور غلامی ؟

یورپ کے متعصب مورخ اسلام پر یہ بے جا الزام لگاتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کا رواج دیا۔ اور اس کو جائز رکھا۔ اور ان کا دعوے یہ ہے کہ یورپ نے اس رسم کو دنیا سے معدوم کیا۔ مگر کیا یہ واقعات پر مبنی اور صداقت سے مملو ہے؟ ہرگز نہیں!

جس وقت اسلام جلوہ گر ہوا۔ اوس کے صدیوں بعد تک یورپ میں یہ رسم جاری تھی۔ غلام تو غلام خانگی ملازمین سے بھی سختی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور ہنوز، جب کہ یورپ کا کثیر حصہ۔ جہالت کی تاریکی میں پوشیدہ تھا۔ اسلام نے غلامی کے، موقوف کرنے۔ اور غلامی کو عملاً بھترین زندگی بنانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں غلاموں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اور غلام و غلام زادے، بادشاہ ہوئے۔ وزیر ہوئے۔ محدث ہوئے۔ فقیہ ہوئے۔ اسلام میں غلاموں کے درجے کے متعلق اب یورپین مورخین کی رائیں ملاحظہ ہوں۔

لیبان؛ ایک فرانسیسی مؤرخ لکھتا ہے"۔ مسلمانوں میں غلاموں کی حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ جو عیسائیوں میں تھی۔ وہ ہمیشہ خاندان کے جزو سمجھے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی اپنے مالک کی بیٹی سے شادی بیاہ بھی کر سکتے تھے۔ اور اعلیٰ درجے پر پہونچ سکتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالمقابل یورپ کے ملازمین کے مشرق کا غلام بہت زیادہ اپنے مالک کا ہم رتبہ ہے"۔

اسلام میں پہلے غلامی کا رواج بہت تھا۔ اور بہت برا سلوک کیا جاتا تھا مگر تاریخ اسلام دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جتنے بڑے بڑے آدمی جیسے حضرت بلالؓ۔ حضرت زیدؓ وغیرہ گذرے ہیں تقریباً سب، غلام اور غلام زادے تھے۔ مگر اُن کے مراتب کس قدر بلند کئے گئے۔ اور ان لوگوں نے بھی وفاداری میں اپنی جانیں لڑادیں۔ اور آج تک انکی وفاداری صبر و استقلال وغیرہ کے کارنامے صفحۂ تاریخ پر زندہ اور روشن نظر آتے ہیں۔

تاریخ سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ۔کُل انگلستان۔ فرانس۔ بلکہ یورپ میں لوگوں میں حسب ونسب۔ عہدے، اور درجوں کے کتنے امتیازات تھے معمولی درجہ کے لوگ اور غریب۔ بے حد نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے پھر غلاموں کا کیا ٹھکانہ مگر اسلام نے غلاموں کے ساتھ۔ وہ سلوک کیا ہے کہ دنیا بھر میں اسکی مثال نہیں ملسکتی یہ بتلایا گیا ہے کہ امتیازات کو ہٹا دینا چاہئے۔ انسان کو بطور انسان جاننا چاہئے۔ خواہ اُسکا سوسائٹی میں بلحاظِ عوارض کوئی درجہ ہو۔ بادشاہ ہو۔ یا گدا۔غریب ہو۔ یا امیر۔ مگر ہے انسان، اور مساوی مواقع کا حقدار۔ مساوات اور رواداری کا کامل نمونہ پیش کیا۔

ایسی مثالیں حضورؐ نے کئی پیش کیں۔ جن میں سے ایک کا ذکر ہم یہاں، کئے دیتے ہیں۔

مراجعت پر مدینہ پہونچکر اسامہ بن حارثؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا جاتا ہے کہ شام کی طرف جائیں۔ قریش نے غلام زادے کی سپہ سالاری قبول کرنے میں پس و پیش کیا۔ ارشادِ نبویؐ ہوا کہ وہ میری امت میں نہیں جو اس لشکر میں داخل نہ ہوگا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایسے جلیل القدر صحابی، حضرت صدیقؓ۔ اور حضرت فاروقؓ بھی اسامہؓ کے ماتحت لشکر میں شامل تھے۔ اس سے بڑھ کر غلاموں سے اور کیا سلوک ہو سکتا تھا۔؟ کیا اس کی مثال یورپ میں کہیں مل سکتی ہے۔؟ ہرگز نہیں۔ یورپ کو حسب و نسب کے امتیازات نے تباہ و برباد کر دیا۔

یونانی تباہ ہوئے کہ ان میں غلاموں۔ اور پیشہ وروں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ نظام ریاست میں ان کو کوئی جگہ نہ دیگئی۔ حقوق شہریت سے وہ لوگ محروم تھے۔ محض ایک آلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن سے امرا اپنی حسب مرضی کام لیتے تھے۔

رومانی تباہ ہوئے کہ ان کے ہاں امرا و غربار کے دو طبقے تھے۔ غربا کی کوئی حقیقت تسلیم نہ کی گئی تھی۔ یونانیوں اور رومانیوں نے جب مسیحیت قبول کی تو، پھر پیری آرک بشپ (بزرگ گرجا)۔ اور پادریوں کی ایک جماعت، اور اُن کے مقابلہ میں، باقی تمام افراد ملک کی وہی حیثیت تھی جو یونانیوں اور رومانیوں میں غلاموں اور پیشہ وروں کی تھی۔

اسیطرح فرانس میں بھی اٹھارویں صدی کے اختتام تک دو جماعتیں، بموسوم پیٹریشن۔ اور پلیبین تھیں (اوّل الذکر اپنے آپکو نہایت ہی ذی اقتدار۔ اور ذی جاہ خیال کرتے تھے، ہر کام میں یہی بڑے ہوتے۔ معمولی آدمیوں کا دخل ہی نہ تھا۔ اور وہ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جسکا نتیجہ مشہور ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایک عظیم الشان انقلاب کی صورت

مجلس شرفاء و مدبران ملک اور عوام و نیچ۔

میں رونما ہوا۔ جو انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہے۔ بعض تاریخ کے دیکھنے سے
پتہ چلتا ہے کہ کچھ زمانہ آگے تک تو یورپ کا یہی حال تھا۔ مگر اسلام کی تاریخ اور خود
اسلام ہے ہی ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ جس نے اخوت و عالمیت کے
مساوات کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اسپر زیادہ بحث کرنا بیکار ہے اسلئے کہ اب ساری
دنیا نے اسے تسلیم کر لیا ہے کہ غلاموں کا رتبہ بلند کرنے میں جو کوشش اسلام نے کی
ہے اسکی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ تاریخ خود شاہد ہے کہ غلاموں کے ساتھ نہ صرف
اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ بلکہ وہ حکمرانی کرتے تھے۔ بادشاہ ہوتے تھے۔ وزیر
تھے۔ عامل تھے۔ قاضی تھے اور وہ سب کچھ تھے۔ جو آزاد ہو سکتا تھا۔

اب دیکھئے قانون دانی وغیرہ میں اسلام نے کیا اصول بنائے اور یورپ کا کیا حال
ہے۔ اسلامی سزاؤں کی نسبت بعض لوگ بعض اصحاب کہا کرتے ہیں کہ وہ سخت اور ظالمانہ
ہیں۔ سزائیں جو آجکل دیجاتی ہیں وہ اصلاحی ہوتی ہیں اور اسلامی سزا اکثر دہشت
سے جرموں کو روک دیتا ہے۔ چھوٹے جرموں کی اصلاحی سزا ہوتی ہے جس کا نتیجہ
اکثر یہ ہوتا ہے کہ مجرم جیل کی فضا میں جا کر اپنے آپ کو درست کر لیتا ہے۔ بڑے مجرم
اصلاحی سزا سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ چوری۔ ڈکیتی۔ قتل و غارت میں اصلاحی
سزا بیکار ہے۔ قاتل کو اگر معاف کر دیا جائے۔ تو جو خون ایک دفعہ سر چڑھ گیا ہے وہ پھر
رنگ لائے گا۔ کسی وقت پھر جوش اٹھیگا تو وہ کسی اور کو قتل کر ڈالیگا۔ ان جرموں کی
سزا میں انتقامی پہلو ہوتا ہے لیکن اب اس جذبہ کو دور کرنے اس سزا کو منسوخ کر دیا
جائے۔ گو فرانس میں جہاں یہ ہوا یہ سزا منسوخ ہو گئی تھی۔ مگر قتل کے اتنے واقعات
ظہور پذیر ہوئے کہ پھانسی کی سزا دوبارہ جاری کرنی پڑی۔ لیکن برطانیہ میں پھانسی
کی سزا قائم ہوتے ہوئے بھی قتل کی وارداتیں روز ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ
پھانسی کی سزا عبرتناک نہیں۔ گو بہت سے اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ پھانسی کی سزا

کے ڈر سے بہت سے قتل کرنے کے جذبے کو روک دیتے ہیں۔ اس جرم کی کثرت کی وجہ یہی
ہے کہ سزا ملنے کی امید مجرم کو آخر تک زندہ رکھتی ہے۔ بھلا خیال کیجئے کہ ایک
پھانسی کا مجرم سزا یافتہ اپیل میں بری ہو جاتا ہے۔ اس سے خود اسیر اور دوسرے دیکھنے
والوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ سزا میں دونوں پہلو [illegible] ملحوظ ہوتے ہیں۔
اسلام نے سزا کا جو مقصد مد نظر رکھا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ وثوق سے کہا جا سکتا
ہے کہ اسلامی ممالک میں جرائم کی اتنی کثرت نہیں۔

دیکھئے چوری کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہے۔ چوری تہذیب و تمدن کا بڑا گناہ
ہے۔ لیکن اگر سزا ابتدا میں کچھ فہمایش بعد میں کچھ قید ہو تو اصلاح نہیں ہوتی۔
ایک شخص دیکھتا ہے کہ چوری میں بے ہاتھ کا ہو جاؤنگا۔ وہ خوف سے لرزتا ہے
اور اپنے آپ کو معمولی کاروبار کے بھی قابل نہ رہنے کے ڈر سے جرم سے باز آتا ہے۔ سزا پانے پر
وہ چوری کے جرم کے قابل نہیں رہتا۔ اور دوسروں کے لئے اس کا مظاہرہ تازیانۂ عبرت ہوتا
ہے۔ اسلامی سزا میں انتقامی پہلو اس لئے نہیں کہ گو برائی کا بدلہ برابر کی برائی دینا جائز
ہے۔ لیکن معاف کر دینا افضل بتلایا گیا ہے۔ اسیطرح قتل کی سزا قتل ہے مگر رشتہ داروں
کو اختیار دیا گیا ہے کہ خون بہا لیں یا معاف کر دیں۔

بعض اسلامی سزائیں ظلم کہی جاتی ہیں۔ لیکن کیا پھانسی کی سزا کو ابھی آپ کے
سامنے ظالمانہ نہیں کہا جا رہا ہے۔ آپ اپنے ذہن میں تہمد کو زیر تصور کر کے رہ جاتے ہیں؟ یہ
تو ہٹ دھرمی یا خراب ذہنیت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شارع اسلام نے جو تعلیم آج سے تیرہ سو برس پہلے فرمائی
اس کی قدر و قیمت ابدی اور ہمہ گیر ہے کہ ذرا سا ادراک ان سب رازوں کو
کھول دیتا ہے۔

اب ہم اسلامی رحم و عفو۔ رواداری و مساوات کا کچھ ذکر کریں گے۔ ابتدا

بتلائیں گے کہ رحمتِ کاملہ کون ہے۔

رحمتِ کاملہ انبیائے سابقین میں حضرت مسیحؑ کو پیکرِ رحم کہا جاتا ہے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ آپ رحم وعفو کی تعلیم میں اور انبیاء سے بہت آگے ہیں۔ لیکن جب تقابل کا چشمہ لگاکر دیکھا جاتا ہے تو حضرت مسیح رحمۃ للعالمین ثابت نہیں ہوسکتے۔ اگر بائیبل کی محرف تعلیم پر اعتماد کیا جائے تو حضرت مسیحؑ کے رحم و کرم کا ہی خاتمہ ہوجاتا ہے جو خود فرماتے ہیں کہ "میں تلوار بنکر آیا ہوں"۔ انہوں نے اپنی مادرِ مشفقہ سے کہا۔ جسکا ذکر ہمنے آگے کبھی کیا ہے کہ "اے بڑھیا مجھ۔ مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔" اگر ہم انجیل مقدس کی رُو سے فیصلہ کرتے تو کیا کرتے؟ اسکا کہنا ہی ہم اسلامی تعلیم کی رو سے کفر جانتے ہیں۔

حضرت مسیح کے رحمت ہونیکی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ بجائے جنگ آپ نے صلح وآشتی۔ کی دعوت دی۔ آپنے فرمایاکہ اگر کوئی تیرے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کردے۔ لیکن صلح وآشتی کو ہر حالمیں رحمت سمجھنا ہی مغالطہ ہے کیونکہ اکثر حالتوں میں بجائے امن وآزادی کے تباہی اور غلامی پوشیدہ ہوتی ہے عالم تنازع البقا میں حضرت مسیح کی یہ مختص الوقت تعلیم بجائے رحمت کے زحمت نہ ہوجائے گی؟ کیا مدافعانہ حرب وضرب جس پر شخص قومی۔ ملکی۔ اور مذہبی حیات کا دارومدار ہے۔ اس اصول کے ماتحت قائم ہوسکتی ہے؟۔ اسی کے مقابلہ میں اسلامی تعلیم کو دیکھئے کہ آنکھ کا بدلا آنکھ۔ اور کان کا بدلا کان۔ جتنی تمپر زیادتی کیجائے اتنی ہی تم بھی زیادتی کرسکتے ہو۔ اسی کے ساتھ، عاجزو نیز بھی رحم کی ترغیب دی۔ اِس اسلام کے بانی نے کیسے کیسے سنگین جرم بھی معاف کئے ہیں۔ آپ نے زہر کھلانیوالوں کا جرم بخشدیا اور آپ ہی کی یہ زرین تعلیم ہے۔

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر ۔۔۔ نہ ہو درد کی چوٹ جسکے جگر پر

اب اور آگے بڑھ کر اسلامی اصول پر نظر ڈالئے۔ تاریخِ عالم میں ہم جن بزرگونکو

پاتے ہیں۔ اور انکی طرز زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نمونے یا تو بذات خود انسان کے لئے بحیثیت رہنما کارآمد نہ رہے یا انکے متبعین کے مبالغہ آمیزی سے حضرت بدھ نے جو بعد میں اوتار مانے گئے۔ پہلا قدم بیوی اور بچہ کو چھوڑ کر رہبانیت کیطرف اٹھایا ہے۔ اور جنگلوں میں گوشہ نشین ہوگئے۔ جب تبلیغ شروع کی تو وہی ترک دنیا کرنے والوں بھکشوؤں کی جماعت بنائی۔ خود بھیک مانگی۔ اور مریدوں کو بھی گداگری سکھائی۔ ترک خواہشات راس الفضائل تھی۔

حضرت عیسیٰ نے "اخلاق انفعالیہ کا وعظ کہا۔ اور پہاڑی خطبہ میں حلم ورافت کا وہ سبق پڑھایا جو عملی دنیا میں ناممکن العمل ہے جیسے تیرے گال پر چپت لگائے تو دوسرا بھی آگے کر دے۔

یہ چند نمونہ میں مذہبیت اور اخلاقیت کے جو افراط وتفریط سے خالی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض انسان ہوا میں قلعے بناتے ہوئے آسمان پر جا بیٹھے۔ اور بعض سوسائٹی کو چھوڑ کر غاروں میں چھپے۔ سوسائٹی کے کام نہ آئے مذہبیت کو نقصان پہونچایا۔

اب سرور عالم۔ اور اسوۂ حسنہ کی زندگی کو دیکھئے کہیں سرگرمی سے زندگی کے فرائض۔ انفرادی۔ خانگی۔ سیاسی۔ اور مجلسی ادا کئے جاتے ہیں۔ کہیں مسجد نبوی کی تعمیر اور کہیں خندق کھودتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، اور بازار سے سودا سلف لاتے۔ کہیں سپہ سالار ہیں اور کہیں قافلہ سالار۔ اور انہی فرائض روزمرہ میں تبلیغ رسالت اور اعلیٰ نصب العین کی تحصیل۔

یہ تھا وہ قابل تقلید نمونہ جسنے جماعت میں۔ صدیقی ایثار۔ اور فاروقی حمیت عثمانی تقوے۔ اور علوی شجاعت پیدا کی۔ آسمان پر بیٹھنے سے اعلیٰ فرائض انسانیت نہیں ادا کئے جاسکتے۔ آسمانیوں کو انسان بننے کے لئے آسمان سے اترنا۔ اور راہبوں کو آدمیت حاصل کرنے کے لئے غار سے نکلنا چاہیئے۔ ورنہ نظام سوسائٹی درہم وبرہم

ہو جائیگا۔ یہ ہے اصل نمونہ واعلیٰ حق اور شامل مخلوق کا۔

ہماری جماعت کی تائیدات آسمانی اور تاریخی دونوں قسم کی تردید کرتی ہے
یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعثت کے وقت ساسانی۔ اور رومانی
دو تمدن دنیا میں موجود تھے۔ ساسانیوں کا حلقۂ حکومت چین تک وسیع تھا۔
عرب وحشی تھے۔ اگر وہ تو وحشی ہی رہتے تو ضرور تھا کہ وہ ان تمدنوں میں سے کسی
ایک تہذیب میں جیسی کہ وہ بڑی بھلی تھی جذب ہو جاتے۔

سب حضور کی تعلیم کے ماتحت اٹھے۔ اور اس ہدایت نامہ یعنی قرآن کے
ماتحت ایسے ابھرے کے دس سال کے قلیل عرصہ میں وہ ان دونوں تمدنوں پر غالب
آئے۔

یہ کیا چیز تھی؟ جناب والا کا اسوۂ حسنہ۔ اور اعلیٰ تعلیم قرآن۔ اسوہ کیا
جس پر عبدہٗ کی قید لگا کر اسکو واجب التقلید اور واجب الاتباع بنا دیا تھا۔ بخلاف
پیشینہ نمونوں کے کرشن اوتار ہیں۔ عیسیٰ ابنِ خدا ہیں۔ عزیر ابن اللہ۔ بدھ اوتار
ہیں۔ اور زرتشت اوصافِ الوہیت سے ممتاز یہ نمونے ایسے فوق الفطرت تھے کہ جنکی
نہ تتبع کی جا سکتی تھی۔ ورنہ تقلید کرنے کی ہمت بندہ کی تھی۔ وہ انسان کیلئے ناقابلِ
حصول تھے۔

اب ہم یورپ کی تمدنی حالت اسوقت کی جب اسلام کی ولادت ہوئی۔ کچھ
بیان کرینگے اور یہ بھی بتائیں گے کہ اسلام نے یورپ پر کیا کیا احسانات کئے۔ اور
اسکا بدلا یورپ نے کس طرح دیا ہے وغیرہ۔

طلوعِ اسلام کے وقت یورپ کی تمدنی حالت کیا تھی۔ نہایت خستہ۔ عرب کا
تمدن بہترین مانا جاتا تھا۔ اور اسلام ہی نے یورپ پر بڑا احسان کیا کہ انہیں متمدن
بھی بنایا! اسکا اعتراف ایک مشہور یوروپین کھلے الفاظ میں یوں کرتا ہے۔

مسیحیوں کو علمی مسائل کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ وہ مجسمہ پرستی وغیرہ میں لگے پڑے تھے۔"

یہ تو تمدنی احسانات ہوئے۔ اب ان مذہبی احسانات کا بھی کچھ ذکر سن لیجئے۔ جو اسلام نے یورپ پر کئے ہیں۔

مسیحی غلط تعلیم پر عمل پیرا تھے۔ اسلام نے سب سے بڑا مذہبی احسان یورپ پر یہ کیا کہ۔ اسنے مسیحیوں کو بتلایا کہ جس چیز کو وہ مسیحیت سمجھتے ہیں۔ اسکو حضرت مسیح کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے یہ صدا بلند کی کہ حضرت مسیح نے تثلیث کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ صدیوں بعد یورپ اس مسئلہ کو سمجھنے لگا ہے۔ چنانچہ اسی اعلان کا اثر تھا کہ لوتھر نے۔ پراٹسٹنٹ چرچ کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اصل مفہوم بخلاف تثلیث مائل بہ توحید ہے۔ لوتھر کی لائف۔ (زندگی) کا مطالعہ کرو تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اصلاح کا خیال۔ اسلام ہی کے فیض تعلیم کا اثر تھا۔

آج بیسویں صدی میں یورپ کے ایک گروہ کثیر نے چار اصول اسلام کی بناء پر قایم کئے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ اوّل یہ کہ "ہم جو نیک کام کرتے ہیں۔ ان میں خاص ہماری منفعت ہے۔"

دوم خدا انسان پر رحم کرتا ہے۔ اور اسکی اصلاح وفلاح چاہتا ہے۔ اور تکلیف بھی۔ صرف اسکے فائدے کی غرض سے دیتا ہے۔

سوم۔ عبادت انسانی طبیعت کے موافق ہونی چاہئے۔ نہ کہ اسکے خلاف۔ اور۔ چہارم جسمانی عبادت۔ نفس کے پاک کرنیکا ذریعہ ہو۔ نہ اور کو مقصد۔ عقلائے یورپ صدیوں کے بعد عیسائی مذہب کے خلاف ان اصولوں کا اعلان کرتے ہیں جنکی تعلیم اسلام آج سے تیرہ سو سال پیشتر دے چکا ہے۔ کیا باوجود ان صاف احکام کے بھی ہم یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ اہل یورپ نے ان ہی کو دیکھنے سننے کے بعد اپنے قواعد مقرر کئے۔ اسلام کسی کو کسی کے ایمان وعقیدے پر

تسلط اور کسی قسم کا اختیار نہیں دیتا حتیٰ کہ رسُول کو بھی جو اختیار دیا گیا ہے وہ صرف تبلیغ اور ارشاد کا ہے نہ جبر و اکراہ کا

اسلام میں عیسائیت کیطرح کسی شخص کو آسمان و زمین کی کنجیاں نہیں دیگئیں۔

یہ اسلام کے وہ زرّین احکام تھے جنہوں نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں اور انکو مقتدایان مذہب کے پنجۂ ظلم اور اندھا دھند تقلید سے آزاد کر دیا اور عقلی آزادی دلائی۔ قبل اسکے جسوقت قوموں کو مقہور اور مغلوب کرکے انکو غلام بنانیوالے اپنی رعایا کو یہ کہہ رہے تھے کہ "عقل کی روشنی کو خاموش کردو اور بصیرت کی آنکھوں کو بند کر دو۔"
"اسوقت اسلام کہ رہا تھا کہ" مذہب میں عقل ہے جسکو عقل نہیں اسکو مذہب نہیں۔"
مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا اصول مسامحت تھا۔ برعکس اسکے ایک عیسائی کا یہ فرض تھا کہ وہ آنکھیں بند کرکے اپنے مقتدایان مذہب کے قول پر آمنّا و صدّقنا کہے۔"

مسلمانوں نے اپنی فتحیابیوں میں بھی لوگوں کو امن و آزادی دی ہے انکے گرجا صلیبوں اور مذہب کی پوری حفاظت کی ہے۔ جب وہ یورپ میں داخل ہوئے ہیں تو اُن ہی اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ اسپین میں عیسائیوں کو مذہب کی عام آزادی حاصل تھی۔ اسکا ثبوت۔ فلپ سوم شہنشاہ اسپین کے پاس سنہ ۱۶۰۲ء میں جو عرضداشت پیش ہوئی تھی۔ جسمیں مسلمانوں کو اسپین سے خارج کرنیکی استدعا کی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے۔ اسمیں یہ تھا کہ مسلمان کسی باتکو روا نہیں جانتے جیسا کہ کانشنس (ضمیر) کی آزادیکو جائز رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں نے اپنی رعایا کو مذہبی آزادی دی ہے۔

اور ایک[۱] یوروپین مورخ لکھتا ہے "اسی طرح قسطنطنیہ پر اسلامی قبضہ کے بعد سلطان محمد ثانی نے فرمان جاری کیا۔ جس سے انکے مذہب میں کسی طرح کا تعرض نہیں کیا گیا۔ بلکہ انکے گرجائیں محفوظ رکھے گئے۔ ان کی سرپرستی کیگئی۔ اور اون ہی کے مذہبی رسومات ادا کرنیکی عام اجازت دیگئی" اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اہل یورپ کو کس طرح مذہبی آزادی، اور حقوق دے تھے!

جب کلیسا کی روحانی زندگی خراب ہوگئی۔ اور اس قسم کے مسائل پر بحثیں ختم نہ ہوئے۔ کہ روح القدس خدا سے یا مسیح سے نکلا ہے وغیرہ وغیرہ تو بہت سے ایسے عیسائی تھے۔ جو ان باتوں سے بیزار ہوکر توحید کی اسلامی تعلیم کو جو نہایت صاف اور جلد سمجھ میں آتی تھی۔ تسلیم کرنے لگے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کثرت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔ جنمیں عام لوگ ہی نہ تھے۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجے کے عام اور شریف عیسائی شامل تھے۔

ایک عیسائی نے جو بائیس[۲۲] سال تک ترکوں میں قید رہا۔ یہ الفاظ لکھے ہیں ترکوں نے اپنا مذہب چھوڑنے پر کسی شخص کو مجبور نہیں کیا۔ سنہ ۱۶۶۳ء میں شیفلر نے لکھا ہے کہ "ترکوں نے عیسائیونکو جبر سے نہیں بلکہ چالاکی سے مسلمان کیا ہے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی مذہبی آزادی، دی تھی۔ اور کس طرح عیسائیوں کو مسلمان بنایا تھا!

اب یورپ کے مذہبی سلوک کو دیکھنا چاہیے کہ اہل یورپ نے مسلمانوں کے ان احسانات کا بدلا کس طرح ادا کیا۔

سب سے پہلے تبلیغ کو لینا چاہیے۔ یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے،

---

[۱] ہسٹری آف..... ازفلٹ۔

اِسلام کی دعوت دی تھی۔ مگر اسکا سب سے بڑا ذریعہ۔ اُنکا طریقۂ حکمرانی اور بہترین اخلاق تھا۔ اسکے ثبوت میں خود یوروبین اصحاب کی رائیں پیش کردی گئیں ہیں اب اسکے بعد دیکھو کہ جب اہل مغرب نے مسلمانوں پر غلبہ پایا۔ توکسطرح اپنی تبلیغ کی۔ اور مسلمانوںکو مسیحی بنایا گیا۔

فبروری ۱۵۰۲ء میں والیٔ اسپین فرڈیننڈ" اور ملکہ "ازابلہ" کا فرمان جاری ہوا کہ خدا کے دشمن (مسلمانانِ اندلس) اشبیلیہ۔ اور اسکے اطراف سے نکالے جائیں اور ایسے راستوں پر قدم نہ رکھیں جو بلادِ اسپین میں پہونچاتے ہوں۔" اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل تھی۔

اہل غرناطہ کے ساتھ صلح کیگئی تو یہ شرط تھی کہ رقم بطور تاوان ادا کریں۔ تو انکی ذات اور اہل وعیال وغیرہ کی حفاظت کیجائیگی۔ مگر چند ہی سال بعد مسلمانوں پر گراں بہا ٹکس لگا کر انکی مالی حالت کو سخت نقصان پہونچایا گیا یہانتک کہ وہ مفلس کردے گئے۔ اسکے بعد اذان حکماً بند کردیگئی اور حکم ہوا کہ لوگ غرناطہ سے نکلکر دیہاتوں اور ویرانوں میں آباد ہوں۔ اس کے بعد جبراً عیسائی بنانیکا حکم ہوا۔ اسکے برعکس مسلمانوںکا سلوک بتلایا گیا ہے کہ جب کسی ملک پر قبضہ ہوتا۔ اور حکمران ہوتے توکسطرح حکمدیا جاتا اور آزادی مذہب وعقل دیجاتی۔

رینالڈ نے لکھا ہے کہ " اسپین نے مذہب کے نام سے جو مظالم کئے۔ جسقدر آدمیوںکو آگ میں جلادیا۔ قتل کیا۔ اور انکو سزائیں دیں اسنے صرف اسی پر قناعت نہیں کیا۔ بلکہ کئی لاکھ آدمیوں نے اپنے ملک کو چھوڑدیا۔ جس میں ہزارہا آدمی راہ میں ہلاک ہوگئے۔ اسطرح اسپین میں تقریباً ایک لاکھ آدمی قتل کئے گئے۔ اور ڈیڑھ ملین کو آدمی کو جلاوطن ہونا پڑا۔

مورخ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ جسوقت عیسائیوں نے اس حکومت اسلامیہ

غرناطہ کو فتح کیا تو انہوں نے اس رواداری کی تقلید نہ کی جو عربوں نے ان کے ساتھ اتنی صدیوں تک مرعی رکھی تھی۔ باوجود متعدد معاہدوں کے عربوں کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ پادری یہ چاہتے کہ ساری قوم۔ عورت۔ مرد۔ بوڑھے بچے ایک دم قتل کردئے جائیں۔

فلپ دوم نے ۱۶۱۰ء میں ان کے اخراج کا اشتہار جاری کیا اور ساتھ ہی ایسے احکام بھی جاری کئے جن سے بہت بڑا حصہ عربوں کا اندلس سے نکلنے کے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔!

غرض کہ یہ واقعات ہیں جنکو یوروپین مورخوں نے بھی بیان کیا ہے۔ جس سے انکی مذہبی تبلیغ کی بھی کیفیت واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح ٹرکی کے یوروپین ممالک پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو یہاں بھی جبراً عیسائی بنایا گیا۔ مسجدوں کو مسمار کیا گیا اور مسلمانوں سے مذہبی آزادی چھین لیگئی۔ المختصر جہاں ہمنے مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور تبلیغی حالت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ مگر اس امر سے بھی انکار نہیں کہ اب مسلمانوں کو ایک حد تک ہر طرح کی مذہبی آزادی دیگئی ہے۔ مگر اسکا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ مسلمان اس آزادی سے نہ صرف مذہب ہی سے آزاد ہو گئے۔ بلکہ مذہب کی ہر ارکان سے مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ آزاد ہے۔

یوروپین تعلقات کے پہلے ایسی حالت نہ تھی۔ اب ارکانِ اسلام سے جسطرح تنفر پیدا ہو گیا ہے۔ اور عباداتِ اسلام کو جسطرح فضول اور لاحاصل خیال کیا جاتا ہے۔ یہ یورپ ہی کا طفیل ہے۔ غرضکہ یورپ نے مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی آزادی دی۔ بلکہ مذہب سے آزاد ہی کر دیا۔ اور یورپ کی طرح مادہ پرست بنتے جاتے ہیں:۔

مؤرخین یورپ اسلام کی موجودہ حالت دیکھ کر اسلام پر یہ حکم لگانا چاہتے

ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام شاید یہی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بڑی اصولی غلطی ہے۔ اصل چیز جو غور طلب ہے وہ مسلمانوں کی جماعت نہیں بلکہ تعلیم اسلام ہے۔ ہملوگ کبھی اس کے مدعی نہیں کہ تعلیمات نبوی پر ہمارا عمل ہے۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ۔ اگر ہم۔ ان پر کاربند ہو جائیں تو ہمسے زیادہ کامیاب۔ اور ہم سے زیادہ مہذب۔ ہمسے زیادہ بامراد۔ اور ہمسے زیادہ ترقی کرنیوالی قوم دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی:۔

ایک انگریز مستشرق نے لکھا ہے۔کہ" عیسائیوں کو کبھی یہ جرأت نہیں کرنی چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے دیکھیں۔ کیونکہ اسوقت ہر دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ یقیناً مسلمانوں کا مذہب سچا ہے۔" اس انگریز نے نہ صرف نماز کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں اسلام کے ہر اصول پر آپ منصفانہ تبصرہ کرینگے۔ اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب پیروی و تقلید کے قابل ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے لیکن غیروں نے اسکی شکایت کیا۔ جب ہم خود ہی اس سے غافل ہیں۔

مسلمان وہ مسلمان تھے جنکی وفاداری۔ عزم۔ استقلال مشہور تھا۔ اسکی تعریف خود ایک عیسائی قلم[1] سے سنئے۔

"عیسائی اسکو یاد رکھیں تو اچھا ہوتا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سائل نے وہ درجہ نشہ دینی آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ابتدائی پیروں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر لیگئے تو انکے پیرو بھاگ گئے۔ انکا نشہ دینی جاتا رہا۔ اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چلدئے۔ برعکس اسکے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آ گئے

[1] اپالوجی" کاڈنہے ہیکنس

بچاؤ میں اپنی جانیں قطرہ میں ڈالکر۔ کل دشمنوں پر آپکو غالب کیا"!

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی اصول کی کیا تاثیر تھی۔ اور اسلام نے، اپنے پیروؤنکو کسطرح گرویدہ کیا تھا۔ ساتھ ہی۔ عیسائی۔ تعلیم بھی۔ ظاہر ہے کہ اسکا کیا اثر ہوا۔ اگر اسمیں اتنا گہرا اثر ہوتا تو وہ اپنے بانئ مذہب کو کبھی اسطرح تکلیف میں چھوڑکر چل نہ دیتے۔

وقت تنگ۔ اور مضمون طویل ہے۔ اس مضمون کا ایک ایک موضوع پر ہی اسقدر۔ بحث کیجائے کم ہے۔ اسقدر کہا گیا۔ مگر شمہ برابر بھی ادا نہ ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ جو سراپا رحمت ہو۔ اسکی رحمتونکا کہاںتک کوئی بیان کرسکے۔ خیر اس موضوع پر۔ اسوقت کے لئے اسقدر کافی ہے۔ فقط

محمد اسحاق

از جناب بدرالدین خان صاحب شکیبؔ

مہر اب دنیا سے رخصت ہو گیا آرام کو
ماہ نے الٹا ہے چہرے سے نقابِ شام کو

چاند تارے کر رہے ہیں ملکوتی بارانِ نور
فرشِ خاکی بن گیا ہے جس سے اک عمّانِ نور

ہے زمیں سے آسماں تک خامشی چھائی ہوئی
اور شاعر کی طبیعت جوش پر آئی ہوئی

ہیں در و دیوار ساکن، کوہ و صحرا ہیں خموش
آبشار و جو ہیں ساکت اور دریا ہیں خموش

ڈوب کر نکلی ہے بحرِ خامشی سے کائنات
یا کسی سحر سے ہے ساکن و مبہوت رات

اے قمر! زیرِ نگیں تیرے ہوا سارا جہاں
تیرا فرمانِ ضیا باران ہے دنیا پر رواں

منظرِ عکسِ رخِ ماہتاب کا کیا پوچھنا
نور کا اک طشت سطحِ آب پر ہے دیکھنا

میں کنارِ آبِ جو بیٹھا ہوا خاموش ہوں
کیفِ حسنِ ماہ سے مبہوت ہوں بیہوش ہوں

کیوں طبیعت کو نہ کر دے لاابالی ماہتاب
شاہدِ فطرت کی ہے شانِ جمالی ماہتاب

از جناب نواب حسن یار جنگ بہادر

یہ چرخِ نیلگوں ابتک ہے کیوں مائلِ اسر باقی؟
مری آہِ رسا میں کیا نہیں کوئی اثر باقی

رہیں کیا تا بمردن چشم میرے یوں ہی تر باقی؟
مسیحا! کیا یونہی روتا رہوں میں عمر بھر باقی

یونہی جلتے رہینگے آشیانے روز بلبل کے
رہے گا آہ و نالوں میں مرے جبتک اثر باقی!

مرے سینے میں جبتک دل ہے غم بھی ساتھ ہے اسکے
رہے گا سر میں سودا۔ دوش پر جبتک ہے سر باقی

مرے سینے میں دل، اور دل میں یوں تیری محبت ہے
رہے جسطرح دریا میں صدف اسمیں گہر باقی

اگر تسکین کو اسوقت وہ آئے تو کیا آئے!
رہا جب چشمِ بسمل میں نہ اک تارِ نظر باقی

ابھی ہو آزمایش۔ ہوں ابھی ثابت قدم میں بھی
ابھی نکلے مرے قاتل! کوئی حسرت ہو گر باقی

رہے قائم ترا میخانہ ساقی، اور تو، جبتک
چمک ہے مہر میں۔ اور آسماں پر ہو قمر باقی

رہے آوازِ قلقل بھی سلامت۔ اور مینا بھی
رہیں جبتک یہ مہر و ماہ و اخترِ بحر و بر باقی

چلینگے سوئے جنگل اب حسن چھوڑ بھی بستی کو
دکھا دینگے جہاں کو جذبۂ دل ہے اگر باقی

"میری نگاہ میں سمندر میں چھپے ہوئے جواہرات اسقدر قیمتی"
"نہیں جسقدر مرد کی محبت عورت کے عمق قلب میں۔ جیوں جیوں"
"قدم گھر کی طرف بڑھتا ہے۔ لطف و مسرت کے جھونکے"
"دل کو ٹھنڈک پہونچانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کی"
"چھت پر نگاہ پڑتے ہی سب کلفتیں بھول بسر ہو جاتی ہیں"
"یہ سب بہار درحقیقت اُس مونس و غمخوار کے دم سے ہے جو"
"بیوی" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔"

مجھے بارہا اس بات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ عورتیں قسمت کے پلٹا کھانے پر اور تباہی کی موسلا دھار بارش میں بھی کسقدر باوفائی اور علو ہمتی سے مردوں کی شریک اور ہمدم رہتی ہیں۔

تباہی اور مالی نقصان جو مردوں کی ہمت توڑ کر انہیں زندہ در گور کر دیتا ہے برخلاف اس کے عورتوں کے جذبۂ الفت اور وابستگی کو برانگیختہ کرتا ہے

اس سے بڑھکر افسردہ کن اور دل شکن کونسا منظر ہوگا کہ ایک حسین و نازک ہستی، جس کے ہر ناز و انداز پر اسکا شوہر فریفتہ ہو۔ اپنے شوہر کی بدنصیبی میں شریک۔ اور اپنی چین کو چین نہ سمجھکر اپنے اوپر نیند حرام کرکے اپنے سرتاج کو تسلی اور دلاسا دینے میں مشغول اور پوری مستعدی سے تکالیف کا سامنا کرنے کو موجود ہے۔

جس طرح انگور کی بیل شاہ بلوط کے پتے سے لپٹی ہوئی۔ اور اُسی سہارے پر اپنی خوشنمائی کے کرشمے دکھلاتی ہوئی بجلی کے گرنے پر اُس کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے سوت کو لپیٹ رکھتی ہے۔

اُسی طرح خالق حقیقی نے یہ بھی مقرر کیا ہے کہ عورت جسکا دار و مدار مرد پر ہے اور مرد کی سو بہار ہے عیش و عشرت میں اس کی ہمدم و ہمنوا۔ اور رنج و تکلیف میں اس کی غمگسار اور سہارا ہے اور اوسی طرح وابستہ رہکر اسکے شکستہ دل کو تھامے۔ جس طرح انگور کی بیل شاہ بلوط کی ٹوٹی ہوئی شاخ کو اپنے دامن میں لیکر سہارتی ہے۔

میں ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کو مبارک باد دے رہا تھا کہ وہ ایک ایسے خوش حال خاندان کے فرد تھے جہاں باہمی اتحاد و محبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "خدا کرے جلد تم بھی بیوی بچوں کے صحبت کے لطف سے بہرہ ور ہو"۔ اگر تم خوشحال ہو تو بیوی تمہاری شریک رہتی اور اگر خدانخواستہ کبھی بُرا وقت پڑے تو وہ تسلی اور دلاسا دینے کے لئے موجود و مستعد ہے۔

میں نے بھی یہ بات خاص طور پر مطالعہ کی ہے کہ ایک شادی شدہ نوجوان ایک مجرّد کے مقابلہ میں مصیبت و تکلیف کے بھنور میں پھنس کر

بہت جلد نجات پاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے اُس کی مونس و غمخوار پر مصیبت پڑیگی ۔ لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ مصیبتوں کا مقابلہ کرنے پر بھی جب اُسے گھر واپس آنے پر بیوی محبت کے جام بھر بھر کر پلاتی ہے تو اُس کی ہمّت اور بلند ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح تکالیف سے نجات پاتا ہے۔

اس پر مجھے اپنے ایک دوست کے گھر کے واقعات یاد آگئے۔ جن پر مصیبت ٹوٹتے میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔

مسٹر رشید میرے بڑے گہرے دوست تھے ۔ انہوں نے حال ہی میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی سے شادی کی تھی ۔ وہ گو متمول نہ تھی۔ لیکن دولت حسن سے مالامال تھی۔ رشید کو دولت کی تمنّا بھی نہ تھی کیونکہ وہ خود ایک رئیس آدمی تھا وہ اپنی بیوی کی آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ اور خوش قسمتی سے دونوں کی طبیعت ایسی گھُل مل گئی تھی کہ میں نے کسی نئے دولہا دولہن کو یوں نہیں دیکھا۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کو تجارت میں گھاٹا پڑا ۔ اور وہ بالکل ٹھنک رہگیا ۔ اُسنے ایک عرصے تک اپنی اس حالت کو کسی پر ظاہر نہیں کیا اس کی زندگی بہت ہی مایوسانہ طریقے سے بسر ہونے لگی ۔ لیکن پھر بھی وہ بیوی کے سامنے اپنی طبیعت کو بہت سنبھالے رکھتا تھا۔

اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ بیوی کو صدمہ پہونچے۔ لیکن وہ تاڑگئی کہ شوہر کے دل پر کوئی چوٹ لگی ہے۔ اُسنے بھتیری کوشش کی کہ میاں کی طبیعت بہلائے لیکن اُس کی ہر بات وطریق جس سے وہ رشید کا دل بہلانا چاہتی تھی رشید پر برچھی کیطرح لگتی ۔ اور وہ اس خیال سے اور بھی افسردہ ہوتا کہ یہ محبت

کی دیوی جو اسے اسوقت بہلانے کے لیے رنگکڑوں دلربائیاں کر رہی ہے جس کے شیریں ترنّم سے روُح کو فرحت ہوتی ہے آخر کار مفلسی کے ہاتھوں اذیت میں گرفتار ہو جائے گی۔ اور یہ انبساط اور دلربایانہ انداز پژمردگی میں ملکر فنا ہو جائینگے۔

آخر کار رشید نے میرے شدید اصرار پر اپنا کچّا چٹھا کھ سنایا میں نے اُس کی درد انگیز کہانی سُن کر اس سے پوچھا کیا تمہاری بیوی کو اس کی خبر نہیں۔ رشید اسپر بے اختیار رو پڑا۔ اور التجا بانہ لہجہ میں کہا " یہ نہ پوچھو " اِس خیال سے کہ میری وجہ سے اس پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ دل ٹوٹا جاتا ہے۔

میں نے کہا کیوں ؟ اگر ان کو اب نہیں تو آگے چلکر تو معلوم ہو ہی جائیگا تم کبتک ان سے اس بات کو چھپاؤگے۔ یہ بہتر ہے کہ تم خود ہی ان سے تمام حالات بیان کر دو۔ دوسرے کے کہنے میں اندیشہ ہے کہ اُن پر شاق گذرے اس کے علاوہ تم اپنے تئیں اُن کی تسلی و دلاسے سے محروم رکھ رہے ہو۔ اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اس طریقے سے اُن پر یہ اظہار کر رہے ہو کہ تم انہیں اپنا ہمدم و رفیق نہیں جانتے۔ وہ ضرور تمہاری اس حالت سے واقف ہو جائیگی یہ ناممکن ہے کہ محبت حقیقی کا زور اُن کو متأثر نہ کرے۔

اُف میں اُن سے کس طرح کہوں کہ میری وجہ سے ان کی امیدوں کا خوُن ہو گیا۔ میرا دل کسطرح گوارا کرے گا کہ میں ان پر اس بات کا اظہار کروں کہ تمہارا شوہر مفلس ہو گیا۔ اس صدمے سے ان کا دل۔۔

....

میں نے دیکھا کہ رشید کو بہت بڑا صدمہ پہونچا ہے۔ اِس لئے میں نے اس کو اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے دی۔ جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو

پھر میں نے کہا کہ "تم فوراً اپنی بیوی پر اپنی حالت کا اظہار کردو۔ تم جلد ان کو اپنی حالت سے واقف کردو۔ تاکہ جو کچھ ردّو بدل کرنا ناگزیر ہو وہ، بعجلت و آسانی انجام پا سکے۔ پہلے تو تمکو اپنا طریق زندگی بدلنا ہوگا۔ نہیں یہ مت خیال کرو کہ لوگ کیا کہینگے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے کبھی دکھاوے سے کام نہیں لیا۔ اور اب بھی تمہارے ایسے دوست موجود ہیں جو تمہیں صرف تمہارے اخلاق کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ تمہارے، ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے کی وجہ سے تمہیں پہلے کی طرح وسعت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔

اپنے همدم و غمگسار کے ساتھ خوش رہنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ محل ہی ہو۔ میں ان کے ساتھ ایک جھونپڑے میں بھی رہ سکتا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوں تو مجھے کسی قسم کی تکلیف کا سامنا کرنے میں تامل نہ ہوگا۔

رشید یہ یاد رکھو کہ "وہ" تمہارے ساتھ اُسی طرح بلکہ اس سے اچھی طرح پیش آئینگی یہی موقع ہے کہ وہ تمکو پوری طرح اس کا یقین کروادینگی کہ ان کو تم سے اور صرف تم ہی سے محبت اور وابستگی ہے

ہر عورت اس بات کی متمنی رہتی ہے کہ موقع ملے تو وہ اپنی محبت کا پورا اظہار کر دکھائے۔ کسی مرد کو بیوی کی محبت کا پتہ اسوقت تک نہیں چلتا۔ جبتک کہ وہ اسے مصیبت میں اپنا ہمدرد و شفیق نہیں پاتا۔

میں نے رشید کو یہ رائے دے کر بھیجدیا۔ لیکن صبح اُس کے نہ ملنے تک مجھے تشویش رہی۔ کہ اسکی بیوی نے اس کے اظہار حالات پر کیا کہا۔

ایک شخص جس نے مصیبت جانی ہی نہ ہو۔ جب مبتلائے مصیبت ہوتا ہے تو اس بارگراں سے نجات پانے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید رشید بھی کسیطرح نجات پانے کے لئے کوئی صورت اختیار نہ کریں لیکن رشید کے آنے پر اطمینان ہوا۔

اُن سے پہلی بات جو میں نے کی وہ یہ تھی ۔" کہو ان پر کیا اثر ہوا" جس کے جواب میں رشید نے کہا۔" کچھ بھی نہیں"۔ بلکہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ" کیا صرف اسی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں"۔ غریب کو اس امر کا پتہ نہیں کہ ابھیں کس قدر تبدیلیاں کرنی ہیں۔ وہ ابھی مفلسی کی تکلیفوں سے ناواقف تھے۔ لیکن اصل امتحان اُس وقت ہوگا جب مفلسی کی کٹھن منزلیں طے کرنی پڑے گی۔

بڑا بھاری کام جو تھا وہ تم کر چکے۔ یعنی اُن پر انکشافِ حالات۔ اب جلد ضروری تبدیلیاں کرو اور ہرگز اس کا خیال نہ کرو کہ دنیا کیا کہے گی۔ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ہر حالت میں خوش رہ سکو۔

کچھ دنوں بعد رشید میرے مکان پر شام کے وقت آئے۔ انہوں نے اپنا عالیشان محل فروخت کرکے ایک چھوٹا سا مکان آبادی سے دو تین میل فاصلے پر لیا تھا۔ اور فرنیچر بھی، جو ضرورت سے زیادہ تھا، نکالدیا۔ لیکن وہ ہارمونیم جس پر" وہ" محبت بھرے ترنم نکالکر اسکا دل بھلاتی رہتی تھیں رہنے دیا۔

اس وقت وہ اپنے گھر جارہا تھا۔ شام کا وقت ہوگیا تھا۔ میں بھی، تفریح کے خیال سے اُس کے ساتھ ہولیا۔ رشید کی چال مستانہ وار تھی۔ اور وہ دن بھر کی محنت سے تھک گیا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد

اس نے آہِ سرد کھینچکر کہا۔ "غریب زبیدہ۔"

میں "۔ کیا ہوا"

رشید۔ "کیا کہوں یہ کیا کم ہے کہ بیچاری پر تمام گھر کا کام پڑا۔ اب اسے وہ کام پڑتے ہیں جو اس نے کبھی اپنی عمر میں نہیں کئے تھے۔"

میں "۔ کیا انہوں نے اس تغیر پر کچھ افسردگی ظاہر کی۔"

رشید۔ "نہیں! وہ تو اور خوش ہیں۔ اور ہر وقت مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔"

واہ ری عورت! رشید! تم اپنے تئیں غریب کہتے ہو۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ تم اتنے کبھی مالا مال نہ تھے۔ اور تم کو ہرگز اس دولت کی خبر نہ تھی جو زبیدہ کے ساتھ ازدواج ہونے پر تمہیں حاصل ہوئی۔

رشید۔ "پیارے دوست! آج پہلا دن ہے کہ زبیدہ محل کو خیر باد کہ کر جھونپڑے میں آپڑی۔ اور حقیقی مُفلسی کا آغاز ہوا۔ آج دن بھر وہ سامان کے رکھنے میں مصروف رہی ہوگی۔ آج اس کو تمام گھر داری کی دشواریوں کا پتہ چلا ہوگا۔ آج اس کو معلوم ہوا ہوگا کہ چین اور آرام کسے کہتے ہیں۔ اور اب وہ دن بھر کی مُصیبت سے تھک کر سر دُھنتی بیٹھی ہوگی کہ دیکھئے آگے چلکر کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

رشید نے جو خیالی منظر کھینچا تھا وہ کچھ ایسا مؤثر تھا کہ خود مجھے اس کا خیال کرکے رنج ہوتا تھا۔

آخر کار ہم سڑک پر پہونچ گئے۔ جہاں سے رشید کا مختصر سا مکان صاف طور پر نظر آتا تھا۔ اور تقریباً دو۔ تین فرلانگ سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔

جب ہم اس چھوٹے مگر خوشنما مکان پر پہونچے جو آراستہ و سجل معلوم ہوتا تھا تو ہارمونیم پر کسی سُریلے راگ نکالنے کی آواز سنائی دی ۔ رشید نے میرا ہاتھ دبایا۔ اور کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پر زبیدہ بیٹھی وہ راگ چھیڑ رہی تھی جو رشید کو بہت ہی مرغوب خاطر تھا۔ ہماری آہٹ پاتے ہی کسی نے کھڑکی میں سے سر نکالا ۔ اور پھر غایب

.... سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی ۔ اور ہم نے نظر پھیر کر دیکھا تو زبیدہ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھی ۔ اس وقت اُس کا لباس نہایت ہی سادہ تھا۔ ململ کی گلابی ساڑی اسکے زیب بدن تھی۔

زبیدہ۔ مسٹر اصغر تسلیم۔

(رشید سے مخاطب ہوکر۔) آپ آگئے! میں آپ کی راہ دیکھ رہی تھی ۔

زبیدہ نے یہ کہا۔ لیکن میری طرف دیکھ کر کچھ شرما گئی۔ پھر سنبھلی۔ اور سنبھل کر کہا۔

"میں نے سب چیزوں کو قرینے سے رکھ دیا۔ اور آپ کی سب چیزیں اپنے اپنے ٹھکانہ پر رکھ دیں۔"

رشید بیوی کے اس کلام پر جس سے تبدیلی حالت کی نسبت کسی قسم کا بھی افسوس ظاہر نہ ہوتا تھا۔ بے اختیار رو پڑا ۔.....

....

رشید کی حالت بعد میں سنبھل گئی ۔ وہ پھر پہلے کی طرح بسر کر زندگی بسر کرنے لگا ۔ لیکن وہ زمانہ جس میں سے اپنے مونس وغمخوار کی ۔ پاک اور سچی محبت کا پتہ چلا ۔ ہرگز نہ بھولا :۔

افضل حسین فاروقی

غزل

نہیں کچھ فکر اب روزِ جزا کی
لگی ہے دُھن کسی زلفِ دوتا کی

ستمگر نے بہت ہم پر جفا کی
مگر اس کے لئے ہم نے دُعا کی

گئے دُ ملے محبت میں کسی کی
دیا دل۔ جان تک ہنس فِدا کی

نہ آنا تھی شبِ فرقت نہ آئی۔
بڑی منت سماجت کی قضا کی

نہیں بھاتی تجھے شانِ متانت
ذرا ہنس دے قسم تجھ کو خدا کی

وہ جیسا ہے اُسے سب جانتے ہیں
شکایت کیا کریں اُس بے وفا کی

مبارک خضر تمکو عمرِ جاوید
ہمیں حاجت نہیں آبِ بقا کی

دلِ ناکام کے مارے ہوئے ہیں
گلہ کس سے کریں کس سے ہوں شاکی

زمانہ کذب سے پُر ہوگیا ہے
نہیں وقعت کہیں صدق و صفا کی

کیا ہے حرص نے دنیا پہ قبضہ
صِفت معدوم ہے فقر و غنا کی

متاعِ دین و دُنیا کو لٹا کر
مئے حُزن آفرین پر اکتفا کی

سید مسعود احمد رضوی
(نظام کالج)

(اور)

جہاز رانی

(از جناب محمد اسمعیل خانصاحب بی اے)

مغلیہ شخصی حکومت کی دور میں جب ہندوستان میں سیاسی اتحاد قائم ہو چکا تو حکومت کی جانب سے ایک بحری استول کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور بنگال ہندوستان کی جہاز سازی کا خاص مستقر قرار دیا گیا۔

اکبر سے قبل ہندوستان میں بحری مصروفیت کا مشکل سے پتہ چلتا ہے البتہ بابر کی دو بحری لڑائیاں مشہور ہیں۔ ایک ۱۵۲۸ء میں دریائے گنگا پر قنوج کے قریب واقع ہوئی جسمیں دشمن کی تیس یا چالیس کشتیاں ہاتھ آئیں اور دوسری دریائے گھاگرا پر جسمیں کھریدکی فوج نے سو دو سو جہاز جمع کر کے بابر سے مقابلہ کیا اسکے علاوہ اور کوئی مہم کا پتہ نہیں چلتا۔

عہد اکبری نے حکومت ہند میں جیسی کہ امید تھی، ہندوستان میں جہاز رانی اور خاصکر بنگال میں جہاز سازی پر بہت زور دیا۔

ہمارے معلومات کا سرچشمہ آئین اکبری ہے۔ یہ کتاب اکبر کی زندگی اور اسکے کارہائے نمایاں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ حکومت نے امارت بحری اور بحری محکمہ کی ترتیب کیلئے کئی بسیط قواعد و ضوابط مدون کئے۔ یہ قواعد و ضوابط

چندر گپت کے بحری قواعد سے بہت مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض قواعد و ضوابط کی بنا پر تو یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ چندر گپت ہی نے انیس سو سال پہلے ان کو مرتب کیا تھا۔ ان قواعد و ضوابط کو کاؤتیلیا نے اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں نہایت احتیاط سے درج کیا ہے۔

اکبر کے بحری محکمہ سے متعلق چار خدمات تھیں۔ جن کے منجملہ پہلی خدمت بحری تجارت کے لیے جہازوں، اور کشتیوں کی تعداد کی تکمیل۔ اور ان کی تیاری کی نگرانی تھی۔

جہاز مختلف وضع۔ اور مختلف مقاصد کے لئے تیار کیے جاتے تھے۔ کچھ ہاتھیوں کے حمل و نقل کے لیے تھے۔ کچھ محاصروں میں استعمال کے لیے تھے۔ اور کچھ تجارتی سامان کی آمد و رفت کے لیے۔ ان کے علاوہ کچھ کشتیاں ایسی بھی بنائی جاتی تھیں جنہیں بود و باش کیجا سکے۔ شہنشاہ کے لیے خاص تفریحی بجرے بھی تھے۔ جن میں نہایت آرام دہ کمرے تھے۔ اور بعض پر دلکش چمن بھی لگائے جاتے تھے۔

اکبر نے سلطنت کے ہر اس حصے میں جو کہ قابلِ جہاز رانی تھا۔ کثرت سے جہاز مقرر کیے تھے۔ لیکن اس کے خاص خاص مرکز۔ بنگال۔ کشمیر۔ اور ٹھٹھہ تھے۔ الہ آباد اور لاہور۔ اور مشرقی۔ مغربی۔ و جنوبی کے اکثر سواحل پر ایسے بھی جہاز تیار کیے جاتے تھے جو بحری سفر کے لیے موزوں ہوں

محکمۂ بحری کا دوسرا فرض یہ تھا کہ ملاحوں کو فراہم کرے جو مد و جزر کے اوقات۔ پانی کے عمق۔ ہوا کے مختلف رُخ۔ اور تہ کی ناہمواریوں سے واقف ہوں۔

ہر ایک جہاز پر مندرجہ ذیل افسر اور ملازم ہوا کرتے تھے ۔

(۱) ناخدا ۔ جہاز چلاتا تھا ۔

(۲) معلم کا فرض ۔ ستاروں کی شناخت ۔ دریا کی گہرائیوں سے واقفیت اور جہاز کو حفاظت سے منزل مقصود تک پہنچانا :۔

(۳) تنزیل ۔ خلاصیوں یا ملاحوں کا سردار ہوتا تھا ۔

(۴) ناخدائے خشب کی خدمت مسافروں کے لئے ایندھن مہیا کرنے ۔ اور جہاز کے لادنے اور خالی کرنیمیں مدد دینے سے متعلق تھی :۔

(۵) سرہنگ کے ذمے جہاز کی آمد و رفت کی اور قیام کا انتظام تھا ۔

(۶) بھنڈاری ۔ جہاز کے گودام کی نگرانی کرتا تھا

(۷) کرانی ۔ اس کے پاس حساب و کتاب رہتا تھا ۔ اور یہ مسافروں کو پانی بھی تقسیم کرتا تھا :۔

(۸) سکانگیر ۔ معلم کے معاون ہوتے تھے ۔ اور ان کی تعداد بیس تک ہوا کرتی تھی :۔

(۹) پنجری کی خدمت یہ تھی کہ مستول پر سے ہمیشہ دیکھتا رہے کہ خشکی ۔ یا کوئی جہاز دکھائی دے ۔ یا طوفان کے علامات نظر آئیں تو فوراً اطلاع کر دی

(۱۰) کنمتی ۔ یا وہ خلاصی جن کا یہ کام تھا کہ جہاز کا پانی خالی کیا کریں

(۱۱) توپ انداز ۔ جنکی تعداد جہاز کی مناسبت سے ہوتی تھی ۔

(۱۲) خاروہ ۔ یا معمولی ملاح ۔ جنکے ذمے بادبان کا اتارنا یا چڑھانا ۔ اور جہاز کی مرمت ۔ اور لنگر کے وقت زمین میں پھنس جانے پر اس کو نکالنا تھا ۔

تیسری خدمت یہ تھی کہ ۔ دریاؤں کی حفاظت کی جائے ۔ اس کام کی ۔ انجام دہی کے لئے ایک ہوشیار ۔ مستعد ۔ اور جفاکش آدمی مامور کیا جاتا تھا ۔

جو گھاٹ ۔ اور معبر کے معاملات کے تصفیہ ۔ تدوین محصول ۔ اور اطلاع پر مسافروں کے لئے کشتیاں مہیا کرنیکا ذمہ دار تھا ۔
تہی دستوں ۔ اور مفلسوں کو بلا کسی معاوضہ کے عبور کی اجازت دیجاتی تھی لیکن تیر کر دریا پار ہونیکی ممانعت تھی ۔
اِس افسر کا یہ بھی فرض تھا کہ سوائے شدید ضرورتوں رات کو کشتی بانی نہونے پائے ۔ اور گھاٹ کے سوائے کہیں دوسری جگہ سامان نہ اُتارنے دے
حقیقت میں اس افسر کے فرائض چندر گپت کے منتظم جہازات کے فرائض کے بالکل مماثل ہیں ۔
چوتھا کام لگان ۔ وصولی ۔ اور معافی محصول کا اہتمام تھا ۔
اکبر کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک سلطنت کی آمدنی کے مساوی محاصل معاف کردیے تھے ۔ درآمد و برآمد پر کسی قسم کا محصول نہیں لگایا جاتا تھا ۔ لیکن کروڑ گیری کی چوکیوں پر برائے نام (تقریباً ڈھائی فی صدی) محصول لیا جاتا تھا ۔ جسکو سوداگر معافی میں شمار کرتے تھے ۔
آئین اکبری میں دریائی محصول اور راہداری کی یہ تفصیل دیگئی ہے کہ ہزار من کے لئے ایک روپیہ فی کوس ۔ اس شرط پر کہ کشتی اور ہمراہیں ایک ہی شخص کی ملکیت ہوں ۔ لیکن اگر کسی اور شخص نے کرایہ پر لیا ہو تو ڈھائی کوس پر ایک روپیہ لیا جاتا تھا ۔
ہاتھی کے لئے دس دام ۔ باربردار گاڑی پر چار دام ۔ اونٹ ۔ گھوڑے اور سامان سے لدے ہوئے بیل مویشی پر نیم دام ۔ اور دوسرے باربرداری کے جانوروں پر $\frac{1}{16}$ دام فی راس لئے جاتے تھے ۔ جن میں ہانکنے والے کا بھی محصول شامل ہوتا تھا ۔ بیس آدمیوں کے گذرنے کے لئے ایک دام مقرر تھا ۔ لیکن اکثر

اُن کو مفت چھوڑ دیا جاتا تھا۔

بنگال میں ارتقائے جہازرانی کے تفصیلی حالات۔ راجہ ٹوڈرمل کے بنگالی نظام محصول (اصل جمع آمدنی) تیار ہوسکتے ہیں جو کہ ۱۵۸۲ء میں قایم ہوا۔ اسمیں بحری صیغہ کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔

اکبر نے محکمۂ بحری کی بنا تین ہزار جہاز سے قایم کی تھی۔ لیکن بعد میں ان کی تعداد گھٹ گئی۔ اور کل سات سو سولہ جنگی جہاز اور کشتیاں علاوہ ان جہازات کے جو زمیندار بہ معاوضۂ جاگیر مہیا کرتے تھے۔ باقی رہگئیں۔

محکمۂ بحری کے ماہانہ اخراجات جن میں نو سو تیس پرتگالی ملاحوں کی تنخواہ بھی شامل تھی۔ اُنتیس ہزار دو سو بیاسی روپئے تھے۔ اور جہازوں کی مرمت، اور نئے جہازوں کی تیاری کا سالانہ صرفہ ملا کر کل اخراجات (۲۵۴۳۴۰) روپئے ہوتے تھے۔

بیڑے کا صدر مقام ڈھاکہ تھا۔ جہاں سے ماگس (Mughs) اور سمندری ڈاکوؤں کے حملوں سے ساحل بنگال کی حفاظت کی جاتی تھی۔ اور تقریباً کُل زرلگان اس کام میں صرف ہو جاتا تھا۔

سنڈل گھاٹ سے لیکر بندر بالسور تک کا پورا حصہ ڈھاکے کے صیغۂ امارت بحری کے زیر نگین تھا۔

ڈھاکہ میں بحری انتظام کے لئے خاص خاص زرخیز مقامات کی آمدنی محفوظ کردی گئی تھی:۔ اور ان زمینات کے تقسیم شدہ تعلقات کی مالگزاری ملاحوں اور افسروں کے مخصوص تھی علاوہ ان پرگنہ جات کے ایک اور لگان آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ اس ضلع کے ملاحوں کی کشتیوں کے علاوہ نئے تیار شدہ جہازوں۔ اور کشتیوں پر بلحاظ جسامت کے ہر آمد یا رفت کے وقت آٹھ آنہ سے

سے لیکر سوا روپیہ تک محصول لگایا جاتا تھا۔ اولاً محصول صرف قصبات سے وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن ان زمینداروں اور کسانوں سے بھی لیا جانے لگا جنکی جاگیرات میں کشتیاں گذرتی تھیں ۔

ارا کانی ڈاکوؤں نے بنگال کے بیڑے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یہ سواحل بنگال پر حملہ کر کے لوگوں کو گرفتار کر لیتے تھے۔ اور دوسرے مقامات پر انہیں فروخت کر دیتے تھے۔ ان کے جہازات کا مضبوطی ۔ اور آلات حرب کی فراوانی ۔ اور ان کے ملاحوں کی قابلیت کی دھاک شاہی ملاحوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی ۔

زمینداروں ۔ اور کسانوں سے محصول لینے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان ڈاکوؤں کا خود بخود استیصال ہو گیا ۔

شاہی بیڑے کی تعمیر کے لئے لکڑی "سلہٹ" سے فراہم کی جاتی تھی ۔ اُس زمانہ میں سلہٹ کی لکڑی مضبوطی اور استحکام عمارات کے لئے بہت مشہور تھی ۔

شہر وینس کا رہنے والا ایک مشہور سیاح (سیزرڈی فریڈرک) ۱۵۶۵ء کے واقعات کی ضمن میں بیان کرتا ہے کہ "سالانہ دو سو۔ ۲۰۰ جہاز نمک سے بھرے جاتے تھے ۔ اور اس حصۂ ملک میں سامانِ جہاز سازی کی اس قدر فراوانی تھی کہ اُس وقت سلطان قسطنطنیہ نے بہ نظر ارزانی شہر اسکندریہ کے بجائے یہاں پر جہازات تیار کروانا زیادہ مناسب سمجھا ۔

ڈھاکہ میں مختلف اقسام کے جہاز تیار ہوتے تھے ۔ سات سو اڑسٹھ ۷۶۸ جنگی جہازوں کے علاوہ ۔ صوبہ داروں کے لئے سرکاری بجری ۔ اور شہنشاہ

کے لئے سالانہ نئے دو شاندار جہاز آگرہ کو یہیں روانہ کئے جاتے تھے۔
زوال سلطنتِ مغلیہ پر یہ جہاز رفتہ رفتہ نوابانِ بنگال کے تصرف میں آگئے تھے۔

ہندوستانی جہاز رانی کا دوسرا مرکز سندھ تھا۔ ابو الفضل نے لکھا ہے کہ ضلع ٹھٹھہ میں چالیس ہزار کرایہ کے جہاز ہر وقت موجود رہتے تھے اُس زمانہ میں لاہوری بندر کو بہت شہرت حاصل تھی۔ اور تاریخِ طاہری کے یہ جستہ جملے اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

شہر ٹھٹھہ اور لاہوری بندر کے درمیان دو روز کی مسافت ہے سمندر اور بندرگاہ کے مابین صرف ایک ہی آباد مقام ہے۔ جس کو "سوئی میانی" کہتے ہیں۔ اس مقام پر میر بندر کی جانب سے ایک مسلح دستہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جسکا فرض یہ ہے کہ ہر جہاز کے داخلہ پر توپ سر کی جائے۔ اس کے جواب میں محافظ خانہ سے توپ سر کی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے تمام بندرگاہ میں جہاز کے آمد کی اطلاع ہو جاتی ہے۔

باز پرس کے بعد جہاز کا تعلق بندرگاہ سے ہونے کی صورت میں، اس کو لاہوری بندر میں لنگر انداز ہونے کی اجازت دی جاتی ہے ورنہ اس کو لاہوری بندر میں روک دیا جاتا ہے۔ اور اسباب کشتیوں کے ذریعہ شہر میں منتقل ہوتا ہے۔

ہم اب اکبر کے بحری معرکوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۵۸۰ء میں۔ راجہ ٹوڈرمل ایک ہزار جہاز کا بیڑا تیار کر کے گجرات کا مالی انتظام قائم کرنے کے لئے روانہ ہوا۔

سنہ ۱۵۹۰ء میں خانخانان کو مرزا جانی بیگ کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔
در مرزا کو زک اٹھا کر مصلحت کرنی پڑی۔

سنہ ۱۵۷۴ء میں اکبر نے بہار اور بنگال کی طرف خان خانان کو داؤد کے، مقابلے کے لئے بھیجا۔ جو پٹنہ اور حاجی پور کے قریب خیمہ زن تھا۔ اکبر بھی خود بڑے جاہ وحشم سے روانہ ہوا۔ حاجی پور اور پٹنہ کی فتح کے بعد۔ خان خانان صوبہ دار بنگال مقرر کردیا گیا۔ لیکن بنگال میں مغل جاگیرداروں اور افغانوں کی بغاوت کیوجہ سے امن قایم نہ ہوسکا۔ اسلئے اکبر نے بنگال پر یکے بعد دیگرے ہندو حاکم مقرر کئے۔ جن میں ٹوڈرمل پہلا حاکم تھا۔ اور دوسرا مان سنگھ تھا جس نے سنہ ۱۵۸۰ء سے سنہ ۱۶۰۴ء تک حکومت کی۔

مان سنگھ کی صوبہ داری کے زمانہ میں مشرقی بنگال نے بحری فنون میں، نمایاں ترقی کی۔ اور بحری مصروفیتوں میں یکایک اضافہ ہوگیا۔
جسوقت سلطنتِ مغلیہ ڈھاکہ میں بحری قوت کے اضافہ میں موجود تھی۔
چند زمینداروں نے اپنی بحری قوتوں میں آہستہ آہستہ ترقی کرلی۔

سری پور۔ اور بکلا۔ اور چندرادویا ہندوؤں کی بحری طاقت کے مرکز بنگئے۔ سری پور کے سردار کیدار رائے نے اُس زمانہ میں بحری قوت کی ترقی کے بعد مغلوں سے جزیرہ سانڈویا چھین کر پرتگالیوں کے حوالہ کردیا۔ اور شاہ اراکان کو اس سردار کی استیصال کیلئے دو شکستیں اٹھانی پڑیں۔

لیکن اُسی زمانہ میں کیدار رائے کو دوسرے طاقتور دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کیدار رائے کی استیصال کے لئے مان سنگھ نے مندارائے کو بھیجا جو لڑائی میں کام آیا۔ لیکن دوسرے معرکے میں جنرل کلک مغل سردار نے سری نگر کے مقام پر کیدار رائے کو گرفتار کرلیا۔ اور وہ کچھ دنوں کے بعد زخموں کی،

بنگال میں راجہ رام چندر راے کے زیر حکومت شہر بکلا۔ بحری قوت کا دوسرا مرکز تھا۔ اس کے متعلق یہ خبر مشہور ہے کہ راجہ جسور کے پنجے سے نکلکر اس نے بہت ہی بہادری اور دلیری سے اپنی جان بچائی۔ رام چندر کی مردانہ دلیری اور شہرت کو اس کے بیٹے کرتی نارائن نے جو بحری فنون جنگ میں کافی مہارت رکھتا تھا اوسیطرح قایم رکھا۔

غرض ان کل تفصیلات اور ان تمام واقعات سے فن جہازرانی میں قدیم زمانہ کے ہندوؤں کی مہارت وذکاوت کا کافی پتہ چلتا ہے ؛-

(ماخوذ)

مولانا محب حسین صاحب محتاج تعارف ہیں۔ آپ نے اپنی بزرگانہ شفقت سے یہ مسدس عنایت فرمایا ہے واقعہ تاریخی ہے۔ اور رنگ میر انیس اعلی اللہ مقامہ کا ہے۔ اس قسم کی تاریخی نظمیں اردو زبان میں بہت کم ہیں۔ ہم اسکو فخریہ زینت وہ مخزن کرتے ہیں

خولہ بنت ازور

الٹا سحر نے چہرۂ انور سے جب نقاب — آیا نظر جہاں کو مشرق میں آفتاب
ہوذبح صبح شام کی تھی بزم ایک خواب — دنیا کی یہ نمود ہے گویا کہ نقش آب

ہستی بے ثباتِ جہاں موجِ بحر ہے
بازیگری فریبِ نظر ہے کہ سحر ہے

ہے ہست اپنی ذات سے ذاتِ خدائے پاک ہرگز نہیں ہے ذاتِ مقدس میں اشتراک
ہے شرکِ ذات سارے گناہوں سے ہولناک آئینے دل کی لوثِ دوئی سے ہوتے ہیں خاک
دل پر جو مہر ہے وہی نشانِ ذات ہے۔
ٹوٹے جو یہ تو جلوۂ ذات و صفات ہے

کہتے ہیں اپنی ذات میں حق و جہاں ہیں دو دھوکا نظر کا ہے کہ زمیں آسماں ہیں دو
سمجھے غلط کہ ذاتِ مکین و مکاں ہیں دو ہے وہم یہ حقیقتِ کون و زماں ہیں دو
دو دیکھتے ہیں ایک کو کیا احولی نہیں
کیا جلوے اس احد کے خفی و جلی نہیں

یہ ثانوی یہ بندۂ تثلیث و بت پرست سمجھے نہیں خدا کو کہ ہے ذات ایک ہست
انسانیت میں مشرک و کافر ہیں یوں پست جسمانیت سے ان کی تو باہر نہیں ہے جست
محبوس مادّے میں مقیّد دوئی میں ہیں
جکڑے ہوئے غضب کے وہ بندِ قوی میں ہیں

جس قوم کے عقائدِ مذہب ہیں نادرست اس کے دل و دماغ و زباں سب ہیں نادرست
تہذیب و خلق و بندگیٔ رب ہیں نادرست کیا فکر ہو عقولِ بشر جب ہیں نادرست
ہے سیم و زر یہ ہیچ جو انسانیت نہیں
جسمانیت ہے خاک جو روحانیت نہیں

توحید جانِ ملت و مذہب ہے بالیقین حیوان سے بھی پست ہیں واللہ مشرکین
معبود ان کا زر ہے دنیا ہے ان کا دین ہر کام میں غرض ہے کوئی بے غرض نہیں

یہ خود پرست معرفتِ حق سے دُور ہیں
چُوکیں گے کیا کہ تشنۂ دنیا میں چُور ہیں

اِس شرک کو مٹاتا ہے اِسلام لَاکلام   جو تشنہ لب ہیں دیتا ہے وحدت کا اُن کو جام
عارف کے مرتبہ سے تو واقف نہیں عوام   حق بھیجتا ہے صاحبِ توحید پہ سلام

باطن میں عینِ حق ہے تو ظاہر میں خلق ہے
شاہی کا تاج سر پہ ہے اور بر میں دلق ہے

لڑتے تھے ظلم و شرک سے وہ عاشقانِ حق   دیتے تھے عام خلق کو توحید کا سبق
ہر وزم میں قرآن کے ورق ؎   کرتے تھے وہ بیان جو مضامین تھے ادق

دِن رات پیروی خدا و رسُول تھی ؎
اِس راہ میں مصیبت دنیا قبول تھی

فصل ۱۰، مسلمان عورتوں کا قید ہونا۔

جب ہو گئیں اسیر مسلمان عورتیں،   پہنے ہوئے تھیں فاخرہ بر میں جو کسوتیں
صبر و شکیب و جنگ کی جن میں تھی عادتیں   تا ایں بہار راہ سے عالی وہ ہمتیں

شیروں سے پنجہ کش ہوں زنانِ عرب وہ تھیں
مشتاقِ موت۔ عاشقِ پیکارِ سب وہ تھیں

ٹھہریں قریب نہر کے پھر مشرکانِ شام   بطرس کے آگے پیش ہوئیں سب وہ لالہ فام
آنکھیں تھیں جنگی جوش شجاعت سے سُرخ جام   ابرو تھے یا کہ تیغ ہلالی رہی بے نیام

تیر نظر سے قلب عدو پاش پاش تھے
ظاہر تو جان تن میں تھی باطن میں لاش تھے

بطرس نے جبکہ چہرۂ خولہ پہ کی نظر ۔ دیکھا کہ پیش چشم ہے خورشید جلوہ گر
چہرہ کی آب و تاب سے حیران تھا جب وہ سر ۔ کہتا تھا سچ ہے سورۂ والشمس والقمر
کہنا لگا قسم خدا نے جو رخ کی عجب ہے کیا
یہ مرتبہ ہے عشق کا اس میں ادب ہے کیا

خوش ہو کے پھر وہ بولا کہ میری ہے یہ حسین ۔ رگڑوں گا اسکے پاؤں پہ صبح و مسا جبین
قربان اسپہ جان ہے اور ملک و مال و دین ۔ قیصر بھی اسکو مانگے تو دینے کا میں نہیں
رکھوں گا میں عزیز اسے اپنی جان سے
شاہی بھی اب نہیں مجھے بہتر مکان سے

مانگے نہ اسکو کوئی کہ میری ہے یہ پری ۔ جھگڑیگا مجھسے کوئی جو اس میں تو ہے چھری
کہتا ہوں صاف صاف نہیں اسمیں خودسری ۔ اسکو کروں جو قتل تو ہوں خون سے بری
سر جائے تن سے پہلو سے دلبر نہ جائیگا
مانگے گا جو اسے وہ سزا آپ پائے گا

سن کر کلام بطرس محکوم حرص و آز ۔ کی عرض اہل فوج نے اس سے بصد نیاز
ہم کو بھی اذن ہو کہ کریں پیش دل کا راز ۔ ہم بھی ہیں مثل آپکے جانباز حسن و ناز
دیجئے ہم افسروں کو بھی حق انتخاب کا
جب تک ہیں سر رہے گا یہ احسان جناب کا

جب ہو چکیں زنان مقید وہ نامزد ۔ باقی رہی نہ مال غنیمت میں دو کد
تھے شکل آدمی میں وہ مردود نام و دد ۔ عزت نہ عورتوں کی نہ کچھ پاس نیک و بد

ظاہر میں خوش لباس تھے باطن میں بہت بُرے
بے دینی و نفاق کے اعلیٰ ثبوت تھے

فصل (۲۷) مقید عورتوں کا مشورہ اور اُن کی لڑائی

آئیں قیام گاہ میں واپس جو سرفروش — کچھ دیر تک تو خیمہ میں بیٹھیں رہیں خموش
خطرہ میں بھی دلیروں کے بر جا تھے عقل و ہوش — پیدا ہوا دلوں میں تہور کا ایک جوش

عزت سے دل میں شعلۂ آتش بلند تھا
بے حرمتی کی زلیت سے مرنا پسند تھا

شامل تھیں اُن میں قوم حمیرہ کی عورتیں — نسل عمالقہ و تبابعہ کی مستورتیں
تھیں سر سے تا قدم وہ حمیت کی مورتیں — چہرہ تھے ان حسینوں کہ مصحف کی سورتیں

عورات بھی یہ آیت رب ودود ہیں
منکر نشان حق سے یہ گبرو یہود ہیں

ہر ایک زن تھی تیغ زنی میں مثال مرد — بچوں کا کھیل جانتی تھیں عورتیں نبرد
پائے نہ شہسوار بھی ان کے فرس کی گرد — تھی گرمی و نقاہت و عطش ان کو آب سرد

بچپن سے دوڑ دھوپ کی عادت پڑی ہوئی
آتی تھی کام جنگ میں جب صف کھڑی ہوئی

تھیں رزم اور بزم میں مردوں کی وہ رفیق — بے دست و پا کی اور مریضوں کی وہ شفیق
رن میں تو سخت گھر میں مگر قلب کی رقیق — بخشتی خلق و تمدن کی تھیں حقیق

گھر میں وہ بیویاں تھیں سپاہی جلال میں
کامل تھیں مرد سے وہ جلال و جمال میں

راوی کا یہ بیاں ہے باسنادِ معتبر — شورہ کیا زنانِ عقیدت نے باہم دگر
بولی یہ خولہ تم تو ہو عورات مفتخر — وہ جرأتِ نبردِ تمہاری گئی کدھر
مشہور ہیں زنانِ عرب کی شجاعتیں
منظور کیا تمہیں ہیں کنیزوں کی خدمتیں

ہر جا تمہاری حرب کے چرچے ہیں لاکلام — مدحت سے گونجتا ہے تمہاری عرب تمام
لرزاں تمہاری تیغ سے ہیں ملکِ روم و شام — مریخ ڈر سے ڈالتا ہے تیغِ بے نیام
تم سے لڑیں یہ حوصلہ کیا دام و دد میں ہے
شیرِ فلک بھی خوف سے برجِ اسد میں ہے

کیا ہو گئی وہ ہمت و جرأت تمہاری آج — دیتے ہیں بزدلوں کو کہیں شیر بھی خراج
لیتے کہیں ہیں گرگ غضنفر سے تخت و تاج — کتوں کا ہاتھیوں پہ بتاؤ کہاں ہے راج
مور و ملخ سے سے بھاگتے مردانِ رن نہیں
شمشیر زن نہیں ہے جو عورت۔ وہ زن نہیں

کیا خدمتِ کنیزیِ کفار ہے پسند — کیا بندگیِ صاحبِ زنار ہے پسند
کیا ہمنشینیِ سقر و نار ہے پسند — کیا دوستیِ خوک و سگ و مار ہے پسند
کیا چھوڑ کر جناں، کو جہنم میں جاؤ گی
کیا ظلمتِ نفوس میں خالق کو پاؤ گی

بے حرمتی یہ تم کو ہے منظور۔ شرم شرم — عفت سے اور شرف سے دور۔ شرم شرم
ہو بزدلانِ روم سے مقہور۔ شرم شرم — دوروزہ زندگی سے یہ مجبور شرم شرم

افسوس ہے جو زن میں شرافت کی بو نہیں
ماوائے خوک و سگ میں بھی یہ زشت خو نہیں

تم پاک، اور وہ پہلوئے ناپاک مشرکین | کیا خوشنما گلاب ہے ہر کین میں کہیں
قلب سیہ سے بھاگتے پھرتے ہیں مہ جبین | ہے زشت رو سے خود متنفر ہر ایک حسین

ظلمت سے نور نور سے ظلمت نفور ہے
شرک میں مو منہ میں عداوت ضرور ہے

بولی عفیرہ سُن کے یہ تقریر پُر اثر | ہوتا تھا جس کے سننے سے بُزدل بھی شیر نر
جو کچھ کہا جناب نے وہ سچ ہے سر بسر | بے شک ہماری ہمت و جرأت ہے مشتہر

لاریب ہم دلیر ہیں۔ اور شہسوار ہیں
لیکن عدو کی قید میں بے اختیار ہیں

کیا عقل کام آئے جو جکڑا ہو بند بند | بیکار شہسوار ہے مر جائے گر سمند
ٹوٹے جو ہاتھ ہیچ ہے پھر نرد بان کمند | ممکن ہے پا شکستہ سے کیا جست اور زقند

تلوار ہو جو پاس تو کیا تیغ زن کرے
موجود ہو نہ فوج تو کیا خاک رن کرے

بھیڑوں سے بکریوں سے بھی اب ہم ہیں پست تر | ہر دم چھری گلے پہ ہے ہر آن خوف سر
ہر وقت ہم پہ پڑتی ہے قصاب کی نظر | بھاگیں کہاں کہ بند ہیں ہر سمت راہ و در

مجبوریاں ہیں جبر ہے کہ راہ مفر نہیں
حکم خدائے پاک سے زور بشر نہیں

خولہ نے سن کے دختر عفار کا کلام | فرمایا قید و بند میں مشکل ہے گرچہ کام
لیکن نہیں ہیں سامنے استادہ کیا قیام | چوبوں کو ان کی سمجھو کہ ہیں تیغ بے نیام

ہمت اگر ہے دل میں تو تلوار چوب ہے
گر بزدلی ہے تیغ بھی بیکار چوب ہے

چوب خیام لے کے لڑو کافروں سے تم — بدلا لہو بہانے کا لو جابروں سے تم
آفات جنگ میں نہیں کیا صابروں سے تم — تسلیم کے مقام میں ہو شاکروں سے تم
جوہر بہادری کے دکھا دو زمانے کو
سمجھو لحد سے بڑھ کے تم اس قید خانے کو

ممکن ہے آئے غیب سے اللہ کی مدد — ظاہر ہو اہل شرک پہ یہ قدرت صمد
دیتا ہے توڑ آہنی پل نالیوں کا مد — کرتا ہے پشہ فیل سے پیکار رد و کد
فضل خدا ہو گر تو عدو دست زیر ہے
کیا انقلاب دہر کے ہونے میں دیر ہے

مارے گئے تو قید کی ذلت سے ہم چھٹے — بے حرمتی سے پنجہ نکبت سے ہم چھٹے
بے دینی و غلامی و خدمت سے ہم چھٹے — بھوک تشنگی اور کلاب کی صحبت سے ہم چھٹے
مرنا ہمارا زیست سے وہ چند خوب ہے
لیکن نہیں بدن کی جکڑ بند خوب ہے

بولی عزیزوں کے شجاعت کے یہ کلام — واللہ اس کے سامنے رائیں ہیں اور خام
بے حرمتی کا لیجئے بطرس سے انتقام — جلنے نہ پائے بچ کے وہ مردود بد کلام
بھگو سران فوج کو چوب خیام سے
ہے آج لکڑیوں کا تقابل حسام سے

سنتے ہی یہ ہر ایک نے لی چوب خیمہ تب — آمادہ نبرد ہوئیں عورتیں وہ سب
خولہ ہوئیں کمند کے عہدہ پہ منتخب — مانے ہوئے تھا جنگی دلیر کو کل عرب

کاندھے پہ انکی چوب تھی اور پیچھے فوج تھی
اٹھتی ہوئی لہو کے سمندر میں موج تھی

پیچھے تھیں انکے دختر عمار نیک نام — انکے عقب میں مادر آبان تھی خوشخرام
سلمہ تھی انکے پیچھے کہ تھا مہر زیر بام — اور انکے بعد اور زنانِ عرب تمام
نعرہ بلند کر کے جو مردانِ رن بڑھیں
چوبوں کو تولتی ہوئیں شمشیر زن بڑھیں

خولہ نے پھر زنانِ بہادر سے یہ کہا — ایک جا رہو۔ نہ ایک سے ہو دوسری جدا
ہے اجتماعِ فوج میں بھی طاقت خدا — پردے میں انتشار کے ہے صورت فنا
گر منفرد ہوئیں تو ہلاکت ضرور ہے،
چوبوں سے ورنہ چور سرِ پُر غرور ہے

یہ کہکے حملہ کر دیا خولہ نے ایکبار — رومی جو سامنے تھا کیا اس پہ ایک وار
وہ ضربِ چوب سخت تھی گرزِ گراں کی مار — سر پہ پڑی تو جوڑ کے ہم رنگ تھا فگار
بیہوش ہو کے گر گیا رومی جو خاک پر
آیا یقین سب کو عدو کے ہلاک پر

دیکھا جو رومیوں نے یہ احوالِ ہولناک — چوبوں کو سر پہ مار کے کرتیں ہیں ہلاک
بولے وہ عورتوں سے اڑاؤ نہ سر پہ خاک — لشکر کا سینہ ہوگا نہ ان لاٹھیوں سے چاک
کرتی ہو کیا کہ آپ ہی برباد کرتی ہو
کیا قید سے ہماری تم آزاد ہوتی ہو

کہنے لگا یہ بطرس مغرور و پُر جفا — اے عورتوں یہ جنگ ہے یہ حرکتیں ہیں کیا
بولیں عفیرہ جان کا دینا ہے اب روا — ہے اب یہی حمیت و غیرت کا اقتضا

— —

عزت کو عار و ننگ سے اپنی بچائیں گے
ہرگز نہیں تمہاری کنیزی میں آئیں گے

بے آبرو کی زیست سے دم بھر جئے تو کیا بے عزتی کے جام بھی دم بھر پئے تو کیا
بے غیرتی کے گنج جو اھر لئے تو کیا بے ہمتی کے فعل جو ہم نے کئے تو کیا
مرکر خدا کے سامنے کس منہ سے جائینگے
دوزخ میں ہمکو ساتھ تمہارے جلائینگے

کچلینگے سر تمہارے انہیں لاٹھیوں سے ہم سمجھے ہیں تم کو مار و سگ و خوک سے بھی کم
ممکن نہیں کہ جنگ سے پیچھے ہٹیں قدم کرتے ہیں شیر نر بھی کہیں بکریوں سے رم
وہ ضرب چوب ہے کہ سر کوہ چور ہو۔
دم میں ہوا۔ حباب سر پر غرور ہو

بطرس یہ سن کے ہنسنے لگا مثل ابلہاں کہنے لگا یہ فوج سے اے رستم زماں
چوبوں کو ان کی چھین کے لاؤ انہیں یہاں تیغ و سناں سے تم نہ کرو ان کو نیم جاں
زندہ پکڑ کے لاؤ انہیں منتشر کرو۔
ہاتھوں کو اپنے خون سے ان کے نہ تر کرو

پکڑے جو کوئی دختر ازور کو پہلوان پہنچائے ان کی شرم و حیا کو نہ کچھ زیاں
وہ میرے واسطے ہیں نہایا سمیں کچھ گماں آباد ان سے روم میں ہو گا مرا مکان
یہ عورتیں ہیں جن پہ کہ مردوں کو ناز ہے
کس جا زنان روم میں یہ امتیاز ہے

سن کے یہ حکم ٹوٹ پڑی فوج روم و شام آئیں سنان و تیغ کے نرغے میں لاکر فام
کانٹوں کا ہر طرف سے گلوں پر تھا ازدحام تھیں خندہ زن وہ دیکھ کے یہ نیزہ و حسام

بالائے شاخ گل پر تو ہیں خار زیر دست
مومن کے ہیں ہمیشہ سے کفار زیر دست

کرتا تھا زن پہ حملہ جو نامردِ بے حیا   کرتی تھی اسکے گھوڑے کا وہ زن شکستِ پا
گرتا تھا جب زمیں پہ فرس سے وہ پُر جفا   سر اس کا مثلِ مار۔ کچلتی تھی مومنہ

مرگِ عدو تھی مار یہ چوبِ خیام کی
غائب سروں سے عقل تھی افواجِ شام کی

گرنے لگے زمیں پہ دھڑ ادھر جو اشقیا   کچلے گئے جو سر تو کہیں ہوا ہوا
مارے گئے عدوئے تیش سے سوا   ہوش اڑ گئے یہ دیکھ کے عورات کی وغا

سمجھے کہ عورتوں میں شجاعت کمال ہے
زندہ پکڑنا شیرنیوں کا محال ہے!

آیا غضب میں بطریس ملعونِ نابکار   چہرہ کمالِ غیظ سے تھا سرخ مثلِ نار
ہونٹوں کو چاب چاب کے کہتا تھا بدشعار   عورات یہ ہیں یا کہ ہیں مردانِ کارزار

پریاں جنہیں میں سمجھا تھا وہ دیو بخت ہیں
یہ گلبدن نہیں ہیں یہ خارِ کرخت ہیں

فصل (۴) رومیوں کا مسلمان عورتوں پر دوبارہ حملہ کرنا

اترے یہ سن کے اسپ سے وہ بانیِ جفا   خنجر سے اور تیغ سے کرنے لگے وغا
کیا چوب اور تیغ و سپر کا مقابلہ   سب عورتیں بھی ہو گئیں آمادۂ قضا

باہم وہ دوڑ دوڑ کے کہتی ہیں جان دو
عزت بچاؤ صبر کا آج امتحان دو

بطرس نے دیکھا جب زنانِ عرب کا جوش — رنج و ملال سے نہ رہے اسمیں رنج و ہوش
تھا دیر تک تعجب و حیرت سے وہ خموش — دیکھا تھا لیڈیوں میں نہ یہ جوش یہ خروش
تھیں اسکی قوم و ملک کی بزدل جو عورتیں
دیکھیں تھیں زنانِ بہادر کی صورتیں

اس سوچ میں تھا وہ کہ پڑی خولہ پر نظر — عزت ار ہیں تھیں رن میں جو ہم تنگ شیر نر
پڑھتی تھیں وہ رجز کہ قوی جس سے ہو جگر — اشعار تھے کہ خنجر و پیکاں تھے سر بسر
سُن سُن کے یہ کلام دلوں میں خروش تھا
مردانگی کا عورتوں میں ایک جوش تھا

کہتی تھیں وہ کہ ہم ہیں حمیرہ کی بیٹیاں — گرز گراں ہیں ہاتھ میں اپنے یہ لاٹھیاں
کرتے ہیں ملے نبرد و شجاعت کی گھاٹیاں — کاٹیں ہیں ہمنے تیغ دو پیکر سے بیٹیاں
دبتے ہماری ضرب سے کوہِ گراں بھی ہیں
ہم بیویاں ہیں گھر میں تو رن میں جواں بھی ہیں

میدانِ کارزار میں آتش فشاں ہیں ہم — رستم بھی جس سے بھاگے وہ شیرِ ژیاں ہیں ہم
زخموں سے گلبدن تو مژہ سے سناں ہیں ہم — برسے لہو سحاب سے وہ آسماں ہیں ہم
تیغ و سپر کے سایہ میں چلتے زمیں پہ ہیں
زخموں کے یہ نشان ہماری جبیں پہ ہیں

بطرس نے دیکھا دخترِ آزور کا جب یہ حال — دوڑا کے اسپ تیز گیا پاس بد خصال
از راہِ لطف و مہر کیا ان سے یہ مقال — اے عربیہ یہ جنگ ہے تیرے لئے وبال

کر رحم اپنے حسن پہ اور اپنی جان پہ
کیا زور ہے زمین کا بتا آسمان پہ

کر کے جدال جان کو کرتی ہے کیوں ہلاک — ہو جائیگا گلوں کیطرح دم میں سینہ چاک
رخسار برگ گل کیطرح ہونگے زیر خاک — ہوگا سپاہ روم کو کب بار نیزہ باک

کیوں مفت جان بر سر پیکار کھوتی ہے
ناحق غریب قوم پہ قربان ہوتی ہے

گھر میں ہے میرے عزت دنیا و ملک و مال — میری شکوہ و شان پہ ہے خود انسری دال
ہرقل کو میرے رتبۂ اعلیٰ کا ہے خیال — تعظیم میری کرتے ہیں امرات اور رجال

مفتون لیڈیاں ہیں مری چال ڈھال پر
قربان جان و دل سے ہیں طرز مقال پر

پھینکو یہ چوب آو میرے پاس تم ادھر — عاشق سے اپنے لڑتی ہو یہ دھیان ہے کدھر
دائم تمہارے پاؤں پہ رکھوں گا اپنا سر — کیوں مفلسی میں کرتی ہو تم زندگی بسر

دنیا کے لطف اٹھاؤ تمدن میں آؤ تم
میزوں پہ بیٹھو خمر پیو۔ خوک کھاؤ تم

یہ سب تمہارے واسطے دنیا کے ہیں سرور — غلمان ہیں غلام تو ہیں لونڈیاں بھی حور
تفریح کو ہیں باغ تو رہنے کو ہیں قصور — انکار ہے مجھ سے تو پھر قتل ہے ضرور

کیوں لڑکے ہم سے غار ہلاکت میں گرتی ہو
دیوانگی ہو عیش و طرب جو پھرتی ہو

خولہ نے جب سنی یہ تعشق کی گفتگو — غصہ سے بولیں مال حکومت پہ ہے تفو
مشرک نہیں ہے مسلم دیندار کا کفو — مومن خدا کے دوست ہیں کفار ہیں عدو

کیا اعتبار۔ مار اگر یارِ غار ہے
کیا دوستی ہے صحبتِ گل میں جو خار ہے

چہ وا ابھی نہ اونٹوں کا تجھکو بناؤں گی
قابو ہوا تو چوب کو سر پہ چلاؤں گی
نار سقر کا راستہ تجھ کو دکھاؤنگی
سامان عیش و تصر کو تیرے جلاؤنگی

سمجھو نگی عاشقی کو تری نیچ گر ہوئی
مدہوش رنز و یہ تیری دردسر ہوئی

خولہ کا جب شقی نے سنا یہ کڑا جواب
غصّے سے اسکی ہوگئی حالت بہت خراب
کھانے لگا وہ مار کی مانند پیچ و تاب
شرم و حیا سے ہوگیا نامرد آب آب

غصّہ سے آگ تیر شرم سے وہ غرق عرق تھا
دیکھو تو اک وجود میں کیسا ہی فرق تھا

للکار کر یہ فوج سے بولا وہ کینہ ور
ہاں اب لڑو نیام سے تلوار کھینچ کر
باقی رہے نہ ایک بھی عورت کے تن پہ سر
گلے کو بکریوں کے کرو ذبح جلد تر

چوبیں ہیں ان کے ہاتھ میں تیر و تبر نہیں
پڑجائیں ڈھال پر تو سروں کو ضرر نہیں

بھاگیں جو زن سے مرد تو ہے شرم و عار و ننگ
غالب ہوئیں جو وہ تو ہے بدنام کن یہ جنگ
خجلت سے ہم پہ عرصۂ دنیا بھی ہوگا تنگ
نکلیگا جیتے ہی جی عار کا نہنگ

چوب زنان سے بھاگ کے کیا شام جائینگے
کیا عورتوں کو اپنی وہاں منہ دکھائینگے

ہرقل کے اور مسیح کے غصے سے تم ڈرو
بہتر ہے بے حیائی کے جینے سے تم مرو
پٹکے کمر کے کھول کے کونوں میں تم دھرو
مردانگی کا دم نہ خبردار اب بھرو

———

حملہ کرو زنان عرب پر ہمت کرکے تم
آؤ نہ پیچھے ضرب سے چوٹوں کی ہٹ کر تم

یہ سن کے عورتوں پہ گرے مردمان شام | نرغہ میں تھیں سگان بد اندیش کے خوش خرام
جو ہرے تھے زنیں تیغ سے سب نے اڑائے تمام | پیتی تھیں مست ہو کے شہادت کے مے کا جام

مرنا خدا کی راہ میں جینا سمجھتی تھیں
مہر نبی کو دل کا نگینہ سمجھتی تھیں +

فصل (۸۸) لشکر اسلام کا عورتوں کی مدد کے لئے آنا اور رومیوں کو ہزیمت دینا

ہاں ساقیا پلا وہ مئے معرفت کا جام | ہو جاؤں جس کے پیتے ہی مسرور شاد کام
بھولوں وہ شکوہ ہائے زمانے کے میں کلام | جن سے ہے پست خاطر اہل سخن مدام

ناقدردانیوں کا زمانہ کی رنج ہے
بدتر جوار سے یہ جواہر کا گنج ہے

شاعر بہت ہیں سامع خوش فہم ہے کہاں | ملتے نہیں ہیں ہند میں اب حرف کے قدردان
فاقوں سے نیم مردہ ہے یہ مادری زبان | پاتے نہیں ہیں شاعر عزت ابھی جو کی نان

منحوس شاعری ہے یہ مشہور عام ہے
نزدیک ناشناس کے بیکار کام ہے

جس قوم کے دماغ میں ہوں پست یہ خیال   کیا پوچھتے ہو اسکی زبان و ادب کا حال
شکوہ نہیں جو ہوں یہ دُرِ نظم پائمال   بگڑا ہو ذائقہ تو کہاں قدر شیرمال
بوسیدہ ہڈیوں کو مزے سے چبائینگے
تازے لذیذ کھانوں کو ہرگز نہ کھائینگے

ہاں اے محبّ یہ چھوڑ شکایاتِ روزگار   کر بے غرض خدا کیلئے ہوسکے جو کار
فرصت کو اس زمانہ میں تو مغتنم شمار   خدمت میں ملک و قوم کی یہ زندگی گذار
مرنے کے بعد دہر میں وہ یاد رہتے ہیں
جو دوسروں کی واسطے تکلیف سہتے ہیں

کرتا ہے یہ بیان وہ راوی جنگ شام   جس کی روایتوں میں کسی کو نہیں کلام
لڑتی تھیں چوب خیمہ سے وہ عورتیں تمام   بیکار ضرب چوب سے تھے۔ خنجر و حسام
چوب دراز وار سے پہلے سروں پہ تھیں
یا دستِ تیغ زن پہ تھیں یا خنجروں پہ تھیں

دونوں طرف سے بڑھ گیا جب جوش کارزار   آئی مدد خدا کی ضعیفوں کو ایک بار
پہونچے قریب لشکرِ کفار دیندار   خالد تھے اور ساتھ تھے انکے بہت سوار
یہ لشکرِ جہاد کا جانباز جوق تھا۔
مرنے کا انکو جنگ میں کیا ذوق و شوق تھا

دیکھا بلند خالدِ جرّار نے غبار   تیغیں برہنہ جس میں چمکتی تھیں بار بار
فرمایا اپنے جوق سے ہے وقت کارزار   لائے خبر کو جلد کوئی تم میں ہوشیار
اس گرد سے عیاں ہے کہ لشکر قریب ہے
آمادۂ نبرد یہ فوج رقیب ہے

رافعؓ نے سن کے حضرتِ خالدؓ کا یہ کلام　　کی عرض حکم ہو تو خبر لائے یہ غلام
پاتے ہی اذن، ہو گیا راہی وہ نیک نام　　گھوڑا ہوا کی طرح سے جاتا تھا تیز گام
دیکھا کہ لڑ رہی ہیں زنانِ عرب وہاں
رکھتی ہیں چوبِ خیمہ کو ہاتھوں میں سب وہاں

خالدؓ سے آ کے کہہ دیا دیکھا تھا جو کہ حال　　بولے وہ شیرِ نر ہیں یہ عورات باجمال،
گھر میں یہ عورتیں ہیں مگر رن میں ہیں رجال　　لیتی نہیں ہیں وقتِ وغا منہ پہ اپنے ڈھال
منہ پر نشانِ تیغ کہ چیچک کے داغ ہیں.
گلہائے زخمِ تازہ سے چہرے بھی باغ ہیں

ان میں ہیں بعض فخرِ قبائل کی بھی نسا،　　حسانؓ کی وہ دخترِ خوش خلق باصفا
عبد الکلال و تبع کی عوراتِ باحیا　　اقرن کی ذی رعین کی نسوانِ باوفا
ان کے سوا کچھ اور بھی اشرافِ قوم ہیں
دلدادۂ جہاد ہیں پابندِ صوم ہیں

واقف ہیں ان کی ہمتِ عالی سے سب جہاں　　اس جنگ سے بڑھے گی بہت ان کی عز و شان
ہو جائینگی زمینِ عرب کی وہ آسماں　　رکھیگا یاد ان کی لڑائی کو یہ زماں
سرمایہ فخر و ناز کا یہ جنگ ہوئے گی
بے ہمتی کے داغ یہ نسواں سے دھوئینگی

اس جنگ سے نصیب ہوئی انکو برتری　　زیبا ہے انکو ہمتِ دوراں سے ہمسری،
ممکن نہیں رجال پہ کیا ان کی فوقیت　　ذی ہمتوں کے سر پہ ہے تاجِ بلندی
عورت ہو خواہ مرد ہو ہمت سے نام ہے
گر یہ نہیں تو آدمی سب کا غلام ہے

اِس جنگ سے بڑھیگی زنانِ عرب کی شان — عزت سے اُن کو دیکھینگے اشرافِ خانداں
اِن پر کرینگی ناز مسلمان بیبیاں — اِنکا رہے گا نام زمانہ میں اور نشان

صورت کو اور مال کو کس جا قیام ہے
لیکن بہادری کو حیاتِ دوام ہے

سُن کے خبر یہ فوجِ مسلمان بہت تھی شاد — تھا لائقِ افتخار کے عورات کا جہاد
مردوں میں جوش و ہمت پیکار تھی زیاد — دیتے تھے عورتوں کی شجاعت کی سب وہ داد

عورات کی کمک کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے
کھاتے ہوئے بھنوؤں پہ اپنے پڑتے ہوئے

ضرار نے اُتار دیا جامۂ کہن — جلدی سے پشتِ اسپ پہ بیٹھے برہنہ تن
آیا زبان پہ حضرتِ خالد کے یہ سخن — عاقل پہ ہے خرابیٔ تعجیل مبرہن

جلدی سے کارہائے جہاں سب بگڑتے ہیں
پاتے شکست وہ ہیں جو جلدی سے لڑتے ہیں

تعجیلِ کار عادتِ شیطان ہے سر بسر — جلدی سے اہلِ سیف و قلم سب ہیں پُرخطر
دم بھر میں جلد بازوں کے تن سے گئے ہیں سر — عجلت میں خوفِ جان بھی ہے اور مال کا ضرر

آغاز انتشار ہے۔ انجام شرم ہے
جلتی ہے ناں تنور میں جب شدت سے گرم ہے

رحمان کا ہے کام تأنی و حلم و صبر — ہوتا نہیں ہے اہلِ تأنی سے ظلم و جبر
کرتا زمیں کو سیر ہے آہستگی سے ابر — مشہور ہیں شتاب روی میں تمام ببر

آہستہ روگان کی کلفت سے دور ہیں
تعجیل میں بتاؤ کہاں یہ سرور ہیں

ضرار نے کہا کہ نہیں تاب صبر اب — روکوں بھی گر میں سب تو دل مانتا ہے کب
رخصت ہوئے دلسے مرے صبر و تحمل سب — اب اذن دیجئے کہ بہت میں ہوں مضطرب
امداد اب بہن کی برادر پہ فرض ہے
مادر کے جب شکم میں تھا تب سے یہ فرض ہے

خالدؓ نے اذن دے کے یہ ضرار سے کہا — جاؤ کہ وقت فتح کا نزدیک آگیا
دیگا ضرور دشمن حق پر ظفر خدا — غلبہ ہے عدل و داد کا مغلوب ہے جفا
ظالم کو زیر پنجۂ مظلوم لاتا ہے
ہرگز پسند اسکو نہیں ظلم آتا ہے

اولاد جو نہ سمجھے رعایا کو بادشاہ — ہوتا ہے آپ اپنے ہی ہاتھوں سے وہ تباہ
کرتا ہے جور و ظلم سے اعمال جو سیاہ — ملتی نہیں ہے اسکو جہاں میں کہیں پناہ
دنیا میں پیچ و تاب ہے عقبیٰ میں نار ہے
قالب جو ٹوٹتا مرکے وہ آدم سے مار ہے

یہ کہہ کے ایک جا کیا پھر فوج کو شتاب — سیدھی صفیں تھیں اور تھی ترتیب لاجواب
گھوڑوں کے منہ ملے ہوئے اور متصل رکاب — دونوں سوار و اسپ تھے جوہر میں انتخاب
اسپ عرب جہان میں مشہور عام ہے
اسکے سوار کا بھی شجاعت میں نام ہے

ترتیب دیکے فوج کو خالدؓ نے یہ کہا — حملہ کرو کہ سامنے ہے دشمن خدا
ہو جاؤ منتشر بسوئے فوج اشقیا — چاروں طرف سے اسکا کرو گھیرا ہوا
حلقہ میں لاکے دشمن دیں کو شکست دو
دونوں یسار اور یمیں کو شکست دو

شاید چھوڑائے قید سے عورات کو خدا ۔ پنجے سے ظالموں کے رہائی کرے عطا
اطفالِ خورد سال سے ہو دور یہ بلا ۔ کر دے ہمارے واسطے بابِ ظفر کو وا
صبر و رضا سے اور توکل سے کام لو
ان سختیوں میں جنگ کی ، ولد کا نام لو

نکلے کلام حضرتِ خالدؓ کا جاں نثار ۔ پہونچے قریب لشکر کفار نابکار ۔
اسلام کے نشان ہوئے پھر تو آشکار ۔ خولہ نے عورتوں سے کہا اے وفا شعار
فوجِ خدا تمہاری مدد کو یہ آئی ہے !
ہو جاؤ خوش کہ دم میں بلا سے رہائی ہے

تمکو خدا نے غیب سے بھیجی ہے یہ مدد ۔ ہوتی ہے کوئی دم میں تمہاری بلا یہ رد
اب کیا لڑینگے ہم سے یہ کفار دام و دد ۔ توڑینگے اپنی راہ سے ہم آہنی بھی سد
شیروں سے کیا ہرن بھی لڑے ہیں زمانہ میں
چھپتی ہے شاہ باز سے چیل آشیانہ میں

فصل (۵) عورتوں کا رومیوں پر غالب آنا ۔ اور اسلام کی فتح اور لشکرِ کفار کا بھاگنا

بطرس نے دیکھیں جب وہ چمکتی ہوئی سناں ۔ کرنیں تھیں آفتاب کی اسکی طرف رواں
تیغیں تھیں یا کہ کوندتی تھیں بجلیاں ۔ وحشت سے اہلِ روم تھے ہر سمت کو رواں

عقلیں سروں کے سینے سے جانیں روانہ تھیں
ارواح بھاگنے کو سر آشیانہ تھیں

بطرس نے دلمیں یہ عورات سی کہا مجھکو تمہارے حال پہ اشفاق ہے موا
کرتا تمہیں صلیب کے صدقہ میں ہوں رہا اس رحم اور کرم کا بجا لاؤ شکریا

کہنا تم اپنے مردوں سی احسان یہ مرا
بس اسقدر ہے خیر میں امکان یہ مرا

رکھتے ہیں گھر میں ہم بھی بہو اور بیٹیاں کرنا نہ تم ہمارے طرف سے کوئی گماں
رکھنا نہ اپنے دلمیں عداوت کو تم نہاں اب جاؤ تم یہاں سے مبارک تمہیں مکاں

رکھنا ہماری مہر و وفا دلمیں یاد تم
کرنا نہ رومیوں پہ کبھی پھر جہاد تم

یہ کہہ کے بھاگا باگ کو گھوڑے کی موڑکر رخ سوئے شام پشت تھی خواہ کی سمت پر
اتنے میں دو سوار پڑے سامنے نظر نکلے تھے قلب فوج مسلماں سے شیر نر

ان میں سے ایک سوار فرس زرہ پوش تھا
لیکن جو دوسرا تھا فقط اسمیں جوش تھا

تھا وہ سوار پشت فرس پر برہنہ تن بر میں زرہ تھی اور نہ کوئی اور پیرہن
تھی پشت اسپ صاف برنگ رخ سمن زیں تھا کوئی اور نہ رکابیں تھی رسن

اسپ و سوار دونوں تحرو میں فرد تھے
گرمی تھی جوش حق کی زمانہ سے سرد تھے

ضرار یہ تھے اور وہ تھے خالد ولید راہ خدا کے دونوں مجاہد تھے اور سعید
راحم تھے مومنوں پہ مگر کفر پر شدید۔ یکتا بہادری میں سخاوت میں تھے فرید

سارے عرب کو انکی شجاعت پہ ناز تھا
رستم کو بھی نصیب نہ یہ امتیاز تھا

خولہ کے پاس آئے جو فرار باوقار
بولیں کدھر کو جاتے ہو تم ہوکے بیقرار
پروا نہیں تمہاری مدد کی ہمیں نہ آر
کافی ہمارے واسطے ہے فضل کردگار
دیتا مدد وہی ہے مصیبت جو آتی ہے
اُس کا فضل نہ ہو تو کہاں سر جاتی ہے

بطرس نے دیکھا بھائی بہن کو جو ایک جا
چلا کے اُسنے خولہ سے از رو سے یہ کہا
جاؤ تم ان کے ساتھ کہ میری ہے یہ رضا
دے ڈالا میں نے تمکو نہیں از رہ عطا
دل کو مرے تمہاری جدائی یہ شاق ہے
کیا کیجئے کہ گھر کا تمہیں اشتیاق ہے

بھاگا یہ کہہ کے وہ تم ایجاد سوئے شام
خولہ نے پیچھے دوڑ کے اس سے کہا کہ خام
کیوں عشق کا تو لیتا ہے اپنی زبان سے نام
بھاگے جو یار سے وہ نہیں یار لا کلام
عاشق کو بے وفا نہیں دیکھا زمانہ میں
جاتا ہے ہمکو چھوڑ کے تو آشیانہ میں

تو بے وفا ہے ہم تو ہیں لیکن وفا شعار
تیری جدائی ہم کو تو ہے سخت ناگوار
یہ امر بھی عرب کے خصائل میں ہے شمار
جان پہ مہربان ہو اس پہ ہیں وہ نثار
ہم دوستوں کو رکھتے ہیں مانند جاں عزیز
یاروں کے سامنے نہیں مال جہاں عزیز

تو چھوڑ ہمکو ہم تجھے چھوڑینگے اب کہاں
پیچھے ہیں ہم بھی تیرے ہیں جائیگا جہاں
معشوق سے تو اپنے گریزاں ہے اب کہاں
دعوے کا تیرے ہے یہی اب وقت امتحاں

کاذب ہے اپنے دعوے میں تو اس قرار سے
پھرتا ہے تھوڑی دیر میں قول و قرار سے

یہ کہکے سامنے جو گئی اسکے وہ دلیر — دہشت سے کانپا اسکو سمجھکر وہ ایک شیر
معلوم ہو گیا کہ نہیں موت میں ہے دیر — کہنے لگا تمہاری محبت سے دل ہے سیر

ٹل جاؤ میرے پاس سے منہ کو چھپاؤ تم
چھوڑا تمہارے عشق کو للہ جاؤ ۔ تم

بولیں یہ سنکے حضرت خولہ کہ واہ واہ — معشوق سے یہ شرم یہ وحشت یہ اشتباہ
اب بھاگتے ہو مجھ سے یہی تھی تمہاری چاہ — کہنا زبان سے سہل ہے دشوار ہے نباہ

جاتے کہاں ہو ہاتھ سے دامن نہ چھوڑونگی
میں تو وفا شعار ہوں منہ کو نہ موڑونگی

بولا وہ پھر ضرار سے اے مرد نا مدار — ہیرا یہ تمہیں میں دیتا ہوں تجھے میں یادگار
یعنی تمہاری خواہش ہو وفا شعار — میری طرف سے تمکو مبارک ہو یہ وقار

لیجاؤ ان کو ساتھ عطیہ ہے یہ میرا
ان معل لاجواب ہدیہ ہے یہ میرا

ضرار نے سنا جو خوشامد کا یہ کلام — بولے کہ اس طرف سے ہدیہ ہے یہ حسام
لازم ہے مہربانیوں کا ہم کو انتقام — حاضر ہے آپ کے لئے یہ سرخ مئے کا جام

نار سقر ہے پاس مگر شام دور ہے
جاؤ کہ انتظار میں وہ ناصبور ہے

یہ سن کے بھاگا پیٹھ دکھا کر وہ بد شعار — ضرار نے جھپٹ کے کیا اسپہ ایک وار
نوک سنان ہوئی جو سرین و کمر کے پار — پٹکا زمیں پہ اسکو فرس سے با ضطرار

اوندھا بلند ہو کے تنِ پہلواں گرا
سر پر زمیں کے ٹوٹ کے کیا آسماں گرا

خولہ نے بڑھ کے چوب سے کچلا سرِ غرور
دم بھر میں ضربِ سخت سے شیشہ تھا چور چور
بطرس ہوا جو قتل۔ پڑا فوج میں فتور
برپا ہوا سپاہ میں پھر ہر طرف نشور
بھاگڑ پڑی غضب کی پھر افواجِ شام میں
کچلے گئے بہت سے عدوا ژدھام میں

فوجِ خدا نے پائی جو کفار پر ظفر
خورشیدِ دیں سے شام میں پیدا ہوئی سحر
نخوت کی اور جہل کی راتیں گئیں گذر
انسانیت کو نفسِ لعیں سے ملی نفر
روحانیت کا سکہ جو بیٹھا جہان میں
آئی صدا نہ غیرتِ حق کی کان میں

بس اے محبؔ نیام میں کر تیغِ آبدار
نیزہ قلم ہے تیرا۔ زباں تیری ذوالفقار
ڈرتے ہیں تیری سیفِ زباں سے اہلِ نار
مظلوم کی مدد میں وہ چلتی ہے بار بار
ہمراہ بیکسوں کی ہے وہ خوف و در دیں
بھاگی ہے اس سے فوجِ جہالت نبرد میں

محب حسین محب

اکسفورڈ

از جناب علی یار خان صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج

قدامت" - جامعۂ اکسفورڈ مشہور آفاق ہے۔ اس کی طرز تعلیم و خصوصیات معاشرت سے کون واقف نہیں۔ خود اس رسالہ میں اس موضوع پر دو مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اگر میں اکثر مضمون نگاروں کی پیروی کروں تو مجھے اکسفورڈ کی قدامت اس کے نرالے رنگ اور اس کی انوکھی تعلیم کا ذکر ضرور کرنا پڑے گا۔ در اصل یہ خصوصیات اس قدر ظاہر اور پُر اثر ہیں کہ ان کے تذکرہ سے احتراز عملاً محال ہے۔ اس لئے میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) کا اکسفورڈ آجتک زندہ ہے۔ یعنی وہ اکسفورڈ جس کے "خوابیدہ میناروں"۔ اور کہنہ گنبدوں میں قدیم روایات، اور قرون وسطیٰ کی دلفریبیاں آجتک موجود ہیں۔ قدامت اس مقام کا اس حدتک خاصہ بنگئی ہے کہ بغیر مُوثر ہونے کے چارہ نہیں۔ اس کے ہر گوشے میں تاریخ چھپی ہے۔ یونیورسٹی کالج (University College) کا نظارہ کیجئے۔ مورخین کی رائے ہے کہ اس کی ابتدا بادشاہ الفرڈ کے زمانے میں ہوئی۔ کرائسٹ چرچ کالج (Christ Church College) کو دیکھئے۔ سید العدد وُلزی (Wolsey) اس کا بانی تھا۔ سینٹ جائلز (St Giles)،

پر سے گذرئے۔ یادگار شہدا (Martyrs' Memorial) دکھائی دیگا۔ یہاں ملکۂ میری (Queen Mary) نے اپنی دینی تعصب کو اس آگ سے مطمئن کیا تھا جس کی جھلس نے ایک طرف تو کرانمر اور رانڈلی (Cranmer & Ridley) کو ہلاک کیا۔
اور دوسری طرف گویا لوتھر (Luther) کے جسم مردہ میں نئی روح پھونکدی۔
ماڈلین کالج (Magdalen College) اب تک موجود ہے۔ جو زمانۂ شورش میں بادشاہ چارلز اوّل (Charles I) کی افواج کا قلعہ تھا۔ غور کیجئے ایک ایسا دارالعلم جس کا موقعہ بذات خود خوشنما ہے۔ اور جس کے پتھر پتھر میں "قدامت" مثلِ شرار بھری ہوئی ہے۔ کیونکر اپنی خصوصیات سے طلبہ کو مرعوب نہیں کریگا۔ آپکے کمرے کی دیواریں کئی ہستیوں کی، معاشرت و زندگی کی رازدار ہیں۔ یہ حجرہ قرونِ وسطیٰ میں یقیناً کسی کی عبادتوں اور مذہبی تعلیم کا گھوارہ رہا ہوگا۔ اس نے جوش و خروش کے مذہبی اور سیاسی مباحث سنے ہوں گے۔ اس کی خلوت میں شاید کسی گلاڈسٹون (Gladstone) نے اپنی قوتِ تقریر کی مشق کی ہوگی۔ روایات پر نظر ڈالئے۔ رات کے آٹھ بجے اور کرائسٹ چرچ کا گھنٹہ قدیم رسم کے موافق بجنے لگا۔ رات کو کسی غلط کاری کی سزا پر پراکٹر (Proctor) نے آپکی گرفتاری کی کوشش کی۔ آپ بھاگ کے کوئنز کالج (Queen's College) کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوگئے۔ اب پراکٹر آپ کو گرفتار نہیں کر سکتا۔ شب کو کالج کے ہال میں سب اس انتظار میں ایستادہ ہیں کہ لاطینی میں دعا پڑھی جائے۔ اور کھانا شروع ہو۔

جامعہ کے قواعد و ضوابط ملاحظہ ہوں۔ ایک قانون یہ ہے کہ طلبہ بی۔اے۔ کی کامیابی کے بعد عام شاہراہوں پر گولیاں نہ کھیلیں۔ غرض قدامتِ اکسفورڈ کی جدید ترین باتوں میں سرایت کرگئی ہے۔ اس کے وجود کا باعث وہ قدامت پرستی ہے جو انگریزی قوم کا ایک عام خاصّہ ہے۔

جدت"۔ مگر جہاں آکسفورڈ میں، ازمنۂ وسطیٰ کے اتنے اثرات زندہ پائے جاتے ہیں۔ وہاں زمانہ حال کی جدید ترین اختراعات بھی موجود ہیں۔ یہ اسلئے کہ اپنی ساری قدامت کے ساتھ آکسفورڈ زمانہ کی رفتار۔ اور علم کی بے شمار اختراعات سے بے خبر نہیں رہا۔ یہ دارالعلم نہ تو صرف آثار قدیمہ سے ہے۔ اور نہ اس میں صرف آثار و علوم قدیم کی، تعلیم دیجاتی ہے۔ جہاں چند طلبہ افلاطون، اور ارسطو کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہاں بہت ایسے بھی ہیں۔ جو برگساں اور رسل Bergson + Russell کی ورق گردانی میں، مشغول ہیں۔ جامعہ کو آئنسٹائن اور ایڈیسن سے اتنا ہی لگاؤ ہے۔ جتنا اُسے ہومر اور ورجل سے انس ہے۔ اور جیسے تعلیم کی ہر لحاظ سے نگہبانی ہوتی ہے۔ اسیطرح تربیت کے بھی، سامان مہیا ہیں۔ خوش اخلاقی اور شرافتِ اطوار کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ طلبہ کی، آزاد خیالی کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے تعلقات مساوات پر موقوف ہیں۔ آپ اُس کے اور وہ آپ کا مدعو ہوتا ہے۔ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ آپ اُس کے ہاں ایک گھنٹہ کے لئے بغرض تعلیم جاتے ہیں۔ وہ آیندہ ہفتے کے لئے ایک مضمون اور اُس مضمون کی تیاری کے لئے چند تفصیلی اور بسیط کتابوں کے نام دیتا ہے۔ ہفتہ بھر مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ اور مضمون کی تیاری کے بعد آپ اُسے، پڑھکر استاد کو سناتے ہیں۔ اُس کے بعد اسی موضوع پر بحث ہوتی ہے۔ استاد اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ کبھی نصِ قرآنی نہیں سمجھی جاتی۔ آپکو اپنی رائے رکھنیکا حق دیا جاتا ہے۔ اور گو شکست اکثر شاگرد ہی کے دامنگیر ہوتی ہے۔ کیونکہ استاد اکثر اپنے مضمون میں عالمِ وقت ہوا کرتا ہے۔ تاہم ایسی آزادانہ رائے کی قدر کیجاتی ہے۔ جس سے عقل و معلومات کا فدا سا بھی انکشاف ہو۔

آزادی"۔ انگلستان کی وضع حکومت صدیوں سے جمہوری رہی ہے۔ اور آزادی رائے یہی جمہوریت کا خاصہ ہے۔ انگلستان کی اپنی تاریخ اسبات کی عمدہ دلیل

ہے کہ انگریز آزادی کے اسقدر عاشق ہیں۔ جسقدر فرانسیسی قوم مساوات کی دلدادہ ہے۔ حکومت وقت خواہ کنزرویٹو (Conservative) خواہ لبرل (Liberal) خواہ شوسلیسٹ (Socialist) انگریز تو ہمیشہ اپنی آزادی کے انتہائے حد کے ساتھ نگہباں رہتے ہیں۔

جس قوم نے نسلاً بعد نسل آزادی کی فضا میں نشونما پائی ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے نوجوان اپنی اس بیش بہا وراثت کی قدر نہ کریں۔؟ جامعۂ آکسفورڈ کی طرز تعلیم و تربیت خود اس آزاد پابندی کی سرپرستی کرتی ہے۔ گو وہاں کے بعض ضوابط و قواعد نہایت سخت ہیں۔ تاہم طریقۂ تعلیم کی ترتیب اس وسیع النظری کے ساتھ دی گئی ہے۔ کہ طلبہ کو بڑی حد تک آزادی نصیب ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آکسفورڈ یونین سوسائٹی کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ اس کی بنیاد ۱۸۲۳ء میں ہوئی۔ اور اس وقت سے آج تک یہ یونیورسٹی کے طلبہ کا کلب رہا ہے۔ جس کا مقصد اولین بحث و مبحث ہے۔ رفتہ رفتہ اس کلب نے ایک بے مثل کتب خانہ جمع کر لیا۔ اور اس کے ہال میں ہفتہ وار ہر جمعرات کو ایک مباحثہ ہوا کرتا ہے۔ "یونین کے صدر نشین، معتمد خزانچی، معتمد کتبخانہ، سب طلبہ ہوتے ہیں۔ اور ان عہدوں کی تقسیم ہر ٹرم بذریعۂ اجماع ہوتی ہے۔

مباحثات کا موضوع کبھی سیاسی، کبھی شوشل، کبھی معاشرتی، اور کبھی ادبی، ہوا کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی موضوع کی تائید یا مخالفت کرنے کے لئے ملک کے مشہور اکابر آیا جایا کرتے تھے۔ مباحثہ میں طلبہ انکی مخالفت یا تائید کرتے ہیں۔ اور مہمان خواہ وزیر اعظم ہوں)۔ خواہ کوئی بڑا رفارمر، اور خواہ کوئی پروفیسر، ان کا مقابلہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر بحث کا موضوع سیاسیات موجودہ ہو تو ایک طرف تو حکومت وقت کی ردوکد۔ اور دوسری طرف اس کی تعریف کیجاتی ہے۔ یونین اسقدر قدیم ہے کہ وہ خود آکسفورڈ کے سلسلہ تعلیم میں موجود ہے۔ آزادی کی یہ انتہا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے

ہٹیر ہے۔ اور اہم مسئلوں پر یونین مثل سیاسی انجمنوں کے اپنی رائے کا اظہار تار یا خط کے ذریعے سے وزیر اعظم سے کرتا ہے۔ اور اس رائے پر اکثر غور و خوض کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ملک کے نوجوان جن کی یہ رائے ہوتی ہے۔ دراصل ملک و قوم کے مستقبل کے نگہبان ہیں ۱۹۲۶ء کے عام ہڑتال میں۔ مثلاً یونین نے صدر الصدور۔ کینٹر بری کی صلح پسند۔ تحریکات میں بڑا حصہ لیا۔ اور صاف طور پر اپنی رائے کا حکومت وقت سے اظہار کیا۔

نہ صرف یہ، اُسی سال حکومت وقت کے زیر حکم وائس چانسلر (Vice Chancellor) نے دو لڑکوں سے جن پر کمیونزم (Communism) کا جرم عائد کیا گیا تھا۔ یہ وعدہ لیا کہ وہ کمیونزم کی تائید میں آکسفورڈ میں نہ تو عام تقریر۔ اور نہ دوستوں سے گفتگو، کریں گے۔ یہ بات طلبہ کو بہت بُری لگی۔ اور انہوں نے یونین میں ایک عام جلسہ کیا جس میں وائس چانسلر کی اس جابرانہ حرکت پر اعتراضات کئے گئے۔ اور یہ پیغام ان تک پہونچا دیا گیا۔ کہ طلبہ کی رائے میں جامعہ کے عہدہ دار آزاد خیالی کی بیخ کنی کے خواہشمند ہیں اور یہ کہ اس آزادی کو طلبہ ایک ایسی بیش بہا قومی وراثت سمجھتے ہیں۔ جس کا نیست و نابود ہونا وہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔

قصہ کہا جاتا ہے کہ ولنگٹن (Wellington) یعنی فاتح واٹرلو (Waterloo) نے جب اپنے قدیم مدرسے کے کھیل کود کے میدان کو دیکھا تو کہا "یہ میری فتح کا باعث ہے یہیں میں نے بہادری۔ اور استقلال کا سبق سیکھا" مجھے اس بات کا یقین ہے کہ انگلستان کے ایسے اکابر مدبرین۔ جیسے گلاڈسٹون (Gladstone) سالزبری (Salisbury) مارلی کرزن (Morley, Curzon) وغیرہ اپنی قوائے تقریر۔ اور نیز اپنے سیاسی خیالات اور سیاسی تربیت کے لئے آکسفورڈ یونین کے ممنون تھے۔

"مساوات"۔ انگریز قوم اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے، سیاسی ردّ و بدل کے میدان میں بہت۔ بلکہ حد سے زیادہ احتیاط سے قدم رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ

تھا، ایک طرف روس۔ جرمنی۔ اور فرانس میں جنگ کے بعد سوشلزم یا Socialism
اشتراکیت کا دور ہونے لگا۔ اور دوسری طرف اسپین اور اطالیہ میں ایک جابرانہ حکومت
سوشلزم کی بیخ کنی کی بنا پر قائم کی گئی۔ انگلستان مقابلتہً ان اثرات سے، غیر متاثر رہا
مگر بعض عالمگیر معاشی وجوہات سے سوشلزم اور خاص کر اس کی وہ تعلیم جو سیاسی۔ اور۔
سوشل مساوات سے تعلق رکھتی ہے۔ انگلستان کی خشک زمین میں تک سرسبز ہونے
لگی۔

نظریہ سوشلزم کی معاشی حقیقت کا کسی کو یقین ہو یا نہ ہو۔ جنگ کے بعد کم از کم،
مساوات کا خیال ہر طبقہ میں سرایت کر گیا۔ یہاں تک کہ انگریز جو آزادی پسند تھے۔
مساوات پسند بھی ہو گئے۔ اس لحاظ سے بھی اکسفورڈ۔ جو قدامت پرستی کا مرکز اعلیٰ سمجھا
جاتا تھا۔ زمانے کی رفتار سے بے خبر نہ رہا۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ اکسفورڈ
کے وہ طلب جنہوں نے وہاں بیس تیس برس ہوئے تعلیم پائی تھی۔ موجودہ اکسفورڈ
کو مطلق نہیں پہچان سکے۔ اگلے زمانہ میں اس دار العلم میں صرف ان طلبہ کا داخلہ ممکن
تھا۔ جن کا خاندان امرا، یا طبقہ وسط میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ زمانے کے انقلاب اور
معاشی ضروریات نے کچھ ایسی حالت پیدا کر دی کہ طبقات قوم میں ایک قسم کی سیاسی
اور اقتصادی یگانگی ہو گئی۔ امرا کا قدیم اعزاز ذکر ماضی ہو گیا۔ اور مساوات کا ڈنکہ بجنے
لگا۔ ڈزرائلی (Disraeli) کے ریفارم بل (Reform Bill) نے پہلی مرتبہ مزدور
پیشہ طبقہ کے سیاسی حقوق کو تسلیم کیا تھا۔ خاص کر اس کے بعد اس طبقے نے انتھک
کوشش کی کہ رفتہ رفتہ اس کے حقوق میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس طبقے نے
اپنے نمایندوں کی ایک پارٹی بنائی۔ اور دار العلوم انگلستان میں ان کا اثر بڑھتا گیا۔
کچھ تو اندرونی سیاسیات، اور کچھ جنگ کے بعد کے معاشی اثرات کی وجہ تھی کہ سنہ ۱۹۲۳ء
میں مزدور پیشوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اور چند مہینوں کے لئے راج رہتی رہی۔

اس زمانے میں انگلستان کی حکومت کے چند وزرا ایسے تھے ۔ جنکے آباؤ اجداد بہ مشکل طبقۂ وسطٰی میں شمار کئے جا سکتے تھے ۔ زمانہ جب رفتہ رفتہ یہ رنگ دکھلا رہا تھا ۔ تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان کا سب سے بڑا دار العلم محض نسب کی بنا پر طلبہ کو داخل ہونیکی اجازت دیتا ۔؟ ۔ اسی طرح اکسفورڈ سے خاندان اور نسب کی قید اٹھ گئی ۔ اور دماغی قابلیت شرطِ اوّلین قرار پائی ۔ آجکل اکسفورڈ کے بڑے سے بڑے کالجوں میں ایسے طلبہ موجود ہیں ۔ جن کے والدین مزدور پیشہ ۔ یا بہت ادنیٰ تاجر ہیں ۔ ان کے ساتھ بعینہ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو امراء و اکابر کے لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ دراصل موجودہ زندگی ۔ "اس قدر" اٹل اور دشوار ہے کہ حرف نسب ۔ او خاندان کو شمار میں لانا محال ہو گیا ہے ۔ ان ہی عالمگیر دشواریوں کی وجہ سے ۔ اکسفورڈ بھی اس حد تک بدل گیا ہے کہ جہاں وہ پہلے امرائے ملک کا دار العلم تھا ۔ اب وہ ساری قوم کا مرکزِ تعلیم بن گیا ہے ۔

مابین الاقوامی اکسفورڈ

اکسفورڈ کی شہرت قرونِ وسطٰی میں تک اس قدر مسلّم تھی کہ وہاں یورپ کے ہر گوشے علماء پڑھانے اور طلبہ بغرضِ تعلیم آیا کرتے تھے ۔ اسی طرح آجکل بھی ۔ اکسفورڈ کے سیاح کو وہاں کثیر التعداد اجنبی دکھائی دیں گے ۔ خاص کر جنگ کے بعد غیر ملکی طلبہ کی تعداد بڑھ گئی ۔ اجنبیوں میں امریکن (American) اور آسٹریلین (Australian) طلبہ کا حصہ سب سے زیادہ ہے ۔ اور ہندوستانیوں کا ۔ اور اگرچہ یوں تو وہاں یورپ ، جنوبی امریکہ ۔ کینیڈا ۔ مصر ۔ ایران ۔ ترک ۔ جاپان و چین کے بہت سے طلبہ ہیں مگر ان تین قوموں کی تعداد سب سے بڑھی ہوئی ہے ۔ اکثر اجنبیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے ۔ اور معلمین جامعہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو اپنی ہم قوم کے ساتھ برتتے ہیں ۔ میرے نزدیک اکسفورڈ کی تعلیم کا

سب سے بڑا جزو غیر ملک والوں سے تعلقات ہے۔ وہاں نہ صرف انگریزوں سے بلکہ کئی متفرق اقوام۔ وطن کے لوگوں سے میل جول ہوتا ہے۔ اور یہ میل جول، وسیع النظری کی نشو و نما کے لئے بے حد ضروری ہے۔

"آکسفورڈ کے ہندوستانی"۔ ہندوستانیوں کی تعداد قریباً اسی کے ہے۔ اور یہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا حصہ سول سروس (Civil Service) اور فارسٹ سروس (Forest Service) کے طلبہ کا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اون کا جو سررشتۂ تعلیمات میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ باقی ہندوستانی قانونی تعلیم پاتے ہیں۔ ان کے ساتھ معلمین و دیگر عہدہ داران جامعہ بڑی حد تک اچھا سلوک کرتے ہیں۔ مگر طلب کے سماجی تعلقات میں رنگ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یوں تو عموماً انگریز غیر ممالک کے لوگوں سے کبھی زیادہ کھلکر نہیں ملتے۔ اسپر جب رنگ کا سوال پیش ہوتا ہے تو تعلقات اور بھی زیادہ نازک ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ کی سوشل زندگی میں ہمارے ہم وطن زیادہ حصہ نہیں لے سکتے۔ ایک حد تک قصور ہندوستانیوں کا بھی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثر انگریزوں سے ملتے ہی نہیں۔ ہندوستانیوں کا بدترین گروہ یا تو وہ ہے۔ یا وہ۔ جو صرف انگریزوں سے ہی ملاقات کرتا ہے۔ اس دوسرے نظریہ پر عمل کرنا۔ شاید کسی زمانہ میں بارآور ہوتا ہو۔ آجکل جب کہ قومیت کا احساس ہندوستانیوں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس قسم کی مابینی اعلیحدگی نہ صرف بذاتِ خود۔ زہریلی ہوتی ہے بلکہ انگریز خود اسے قابلِ مضحکہ سمجھتے ہیں۔ آکسفورڈ میں رنگ کے سوال کے موجد اکثر وہ ہندوستان سے واپس شدہ انگریز ہوتے ہیں۔ جن کی نظروں میں ایک شریف سا شریف، اور لائق سا لائق ہندوستانی ایک نیچ قوم والے۔ یا ایک غلام سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتا۔ حال میں،

ایڈنبرا کے سارے رسٹورنٹ والوں نے ہندوستانی طلبہ کو اندر آنے کی ممانعت کردی یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کیونکہ لندن میں آج تک ایسے ہوٹل وغیرہ موجود ہیں۔ جہاں ہندوستانی قدم نہیں رکھ سکتے۔ خود وسیع النظر آکسفورڈ میں چند برس پہلے ایک چائے خانہ تھا۔ جہاں ہندوستانی نہیں جا سکتے تھے۔ یہ تفریق طبقہ کی زہر یلی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اسی طبقے کا اثر ہے کہ کبھی کبھی جامعہ کے وزن میں نئے تفرقی طریقوں سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستانیوں کے داخلے میں اقدام کی مشکلات پیدا کی جائیں۔ اور اگر یہ کوشش بڑی حد تک ناکامیاب ہوئی ہو تو وہ آکسفورڈ کے ان بڑے بڑے ہندؤوں کی سعی و جہد کی وجہ سے جن کی وسیع النظری ضرب المثل ہے۔ اور جن کے صدر اعلیٰ سر مائیکل سیڈلر Sir Michael Sadler ہیں۔

جہاں اور قوموں کے طلبہ نے آکسفورڈ میں اپنا اپنا کلب شروع کیا۔ وہاں ہندوستانیوں نے بھی ۱۹۰۰ء میں اپنی ایک انجمن قایم کی۔ جس کا نام "مجلس" ہے۔ حال میں چند تنگ نظر انگریزی رسائل کی بے بنیاد بدگمانی کی وجہ سے اس پر "کمیونزم" (Communism) کا جرم عاید ہوا۔ مگر دراصل مجلس کسی خاص سیاسی پارٹی کی نمائندہ نہیں ہے۔

اس بات کا اعتراف خود وائس چانسلر Vice Chancellor نے ان ہی رسائل میں کیا ہے۔ مجلس میں ہر قسم کی رائے کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ انجمن یونین کی طرح بحث و مباحثے کے لئے قایم کی گئی تھی۔ اس لئے اس میں اختلاف رائے کی بہت گنجایش ہے۔ اکثر اوقات مشاہیر انگلستان آن کر مباحثے میں ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان کے سیاسی۔ اقتصادی اور معاشی مسئلوں پر شد و مد سے بولتے ہیں۔ مجلہ ہندوستانیوں کی ...

ہندوستانی وہاں آ کر انگلستان کی آزادی پرست فضا میں اپنی رائے کا کھلی طرح اظہار کر سکتے تھے۔ مجلس کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اسکی فضا میں ہندوستان و مسلمانوں کے تفرقے نشوونما نہیں پا سکتے۔ اس کے مباحثوں کا نکتہ نظر قومی ہے مذہبی نہیں۔ وہاں پنڈت مالوی کی تقریروں پر اسقدر تالیاں دی جاتی ہیں جس قدر سر عبدالرحیم کے بے فرقہ وارانہ تعصب کی تحسین کی جاتی ہے۔ نہایت تعجب ہے کہ جب چند لندن اور کیمبرج کے مسلمانوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک مسلم ایسوسیشن Muslim association آکسفورڈ میں بھی قائم کیا جائے۔ تو آکسفورڈ کے مسلمانوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس خیال سے کہ اگر آج نہیں تو آئندہ کسی دن شاید یہ انجمن مسلمانوں میں تعصب، اور ہندوستانیوں میں تفرقہ پیدا کریگا۔ اس اتحاد کی روح ہی ہمارے قوم و ملک دے سکتا ہے۔ جس کا ہندوستان کی خانہ جنگیوں اور کشمکش و تنظیم کی پیشہ دوانیوں کو دیکھ کر مارے شرم و افسردگی کے خون ہو کر رہ گیا ہے۔

دو برس ہوئے۔ آکسفورڈ کے ہندوستانیوں نے ایک رسالہ کی اشاعت کی کہ جس کا مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ اس میں ان ہندوستانی طلبہ کی رائے کا اظہار ہو۔ جو وطن سے دور غیر ملکوں میں اپنے ملک کی بہبودی، اور خود اپنی تعلیم کی غرض سے نئی نئی چیزیں دیکھ رہے ہیں اور نئے نئے نکات نظر پیدا کر رہے ہیں۔ اس میں نہ صرف انگلستان کے بلکہ سارے یورپ اور امریکہ کے ہندوستانی مضامین لکھتے ہیں۔ یہ رسالہ سیاسی۔ معاشی اور اقتصادی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہندوستانی طلبہ کو تبادلہ خیالات کا موقعہ ملتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہو اگر نظام کالج میگزین میں حیدرآبادی طلبہ میں ان مقاصد کو انجام دینا شروع کر دیں۔ ورنہ صرف یہ کہ تبادلہ خیالات کا وسیلہ بن جائے بلکہ طلبہ کو ان تاریخی معاشی و اقتصادی مسلوں کے حل و عقد کا ذوق شوق دلائے جن سے ہماری عزیز ریاست کی زندگی وابستہ ہے

{کیسلوٹ لاین کی کتاب "انقلاب روسیہ ۱۹۱۷ء - ۱۹۲۶ء" کے چند اوراق}

ماسکو میں میں نے محکمۂ پولیس کے افسر اعلیٰ سے کئی مرتبہ طویل ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک
جوان آدمی تھا اسکے چہرے سے بُردباری و دانشمندی آشکارا تھی۔ میں اس کی نسبت
اچھے خیال رکھتا ہوں اس نے مجھے بتایا کہ اہل پولیس کی اپنی خاص ٹریڈ یونین —
(Trade Union) بھی قائم ہے۔ اور ان کو حالاتِ حاضرہ اور سیاسیات کی
تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان پر اہل حرفہ و کاشتکار افسر مقرر کئے گئے ہیں۔

پولیس کا نظام حکومت اسی طرح وزارتِ داخلیہ کے تفویض ہے۔ جیسے کہ
محکمۂ پولیس اس ملک میں (یعنی لندن میں) ہوم آفس کے زیر نگرانی۔ لیکن یہ
روسی پولیس ایک نیم فوجی طاقت ہے۔ بہت زیادہ ہتھیار سے آراستہ۔ اور یونیفارم جو وہ
پہنتے ہیں۔ سیاہ سرخ چھاتا دار — فوجی ڈریس سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔
نگہداشت و حفاظتِ امن کی ذمہ داری کو وہ انجام دیتے ہیں جو کہ خاص پولیس کا وظیفہ
ہے۔ لیکن ساتھ ہی بوقت ضرورت مقامی ہنگامہ و فساد کے فرو کرنے کے لئے بھی ان سے
بآسانی خدمت لی جاسکتی ہے۔ جی۔پی۔یو۔ (محکمۂ راز۔ یا خفیہ پولیس) سے اس کا
وجود قطعاً علیحدہ ہے۔ جس کے افعالِ شنیعہ کا تذکرہ گزشتہ باب میں کیا گیا ہے۔

محکمۂ راز بذاتہ ایسا مکمل محکمہ ہے جس کی اپنی ہی پولیس۔ خفیہ پولیس اور فوج علیحدہ موجود ہے

میں نے رائج الوقت سرکاری ضوابط کو بھی دیکھا۔ جس میں پولیس کے فرائض و اختیارات درج تھے۔ ان کے صفحات بجنسہ ان مذموم ضوابط کی نقل پائے گئے جو گزشتہ حکومت کے دور میں رائج تھے۔ جو الفاظ کہ ایک میں استعمال کیے گئے تھے۔ دوسرے میں ان کو حرف بحرف دہرایا گیا تھا۔ بولشویک مطبوعات میں تو یہ صاف طور پر بتلایا گیا تھا۔ کہ ان کا مقصد سوشیلزم ہوگا۔ لیکن بظاہر حکومت راز کے سوشیلزم میں تبدیل ہو جانے سے۔ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں شخصی حکومت کے اصول مسلم برقرار رہے۔ اور انقلاب کے باوجود پولیس کے نظم العمل میں تغیر و اصلاح کی ضرورت نہیں پائی گئی۔

پولیس کو ہدایات دی جاتی ہیں کہ انقلابی پروپاگنڈہ کے متعلق اپنے کان کھول رکھے۔ اکثر کرایہ کے مکانات و دوکانات میں جایا کرے۔ اور رہنے والوں کے رجسٹر کو بغور دیکھا کرے۔ ان مقامات کے نگہبانوں سے ملکر رہنے والوں کی حرکات و سکنات کی خبر رکھے۔ اور ان نگہبانوں کا یہ فریضہ قرار دیا گیا کہ سیاسی ناپسندیدہ مقیمین کے حالات سے پولیس کو مطلع کرتے رہیں۔ ماسوا اس کے پولیس کو یہ بھی حکم تھا کہ عوام کو راستہ میں آلاتِ آتشین کے استعمال سے روکیں۔ جس سے کہ دوسرے رہبروں کی جان کا خطرہ ہو۔ ایک اور محض ایک ضابطہ ایسا بھی دیکھا اور وہ پولیس کے اپنے پستول رکھنے کے متعلق تھا۔ انہیں اس امر کی اجازت دی گئی تھی کہ اگر راستہ میں جنگلی جانور نظر آئیں تو ان پر فیر کریں۔ کیونکہ بولشویک انقلاب کے جب سے بھیڑیے بیشتر شہر میں گھس آئے تھے۔

پولیس کے افسر اعلیٰ نے نہایت راستبازی سے مجھ سے بیان کیا کہ آجکل چوری بے ایمانی مرض العام ہو گئی ہے۔ سرحدوں پر گھوڑوں کی چوری اب معمولی واقعہ

ہو گیا ہے۔ اور ممنوعہ اشیاء کی تجارت بکثرت بڑھ گئی ہے۔ واقعہ کا واز ثبوت دوکانات سے ہے۔ بیرونی تجارت روس میں کلیتہً حکومت کے قبضے میں ہے۔ اسی وجہ سے ممنوعہ اشیاء کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ درجہ کی فیشن ایبل چیز نظر آجائے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ناجائز طریقہ سے داخل مملکت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ حکومت باہر سے نفیس اشیاء منگواتی ہے اور سلطنت میں بھی نفیس چیزیں بناتی ہے جو کار آمد ہوں آرائش و دیگر اسباب تعیش کا داخلہ قطعی ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھی کہ روز مرہ کی اشیاء میں خوبصورتی و نفاست بھی پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں اور نہ حکومت ابھی صنعت کو ترقی دیکر اس قابل کر سکی کہ عمدہ اور سستی چیزیں پیدا کر سکے۔ اس طرح اس سوشیل حکومت میں انفرادی کوشش اور ممنوعہ اشیاء کی تجارت کی کافی گنجایش و موقع ہے۔

اس کے اور وجوہات بھی ہیں۔ وہ یہ کہ اس سوشیل حکومت کے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ ہر ایک باشندے کو بہ آرام بسر اوقات کا اہل کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد اس سوشیل جماعت کے خلاف نبرد آزما ہونے پر مجبور ہوئی۔ اگرچہ حکومت کے محکمہ پولیس و محکمہ ان کا جال ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہ قوتیں شخصی ملکیت و حکومت کی معقول حفاظت نہیں کر سکتیں۔ اور واقعہ ہے کہ ہر ایک دوکان و بنک اور ہر ایک کاروباری مقام کے باہر دربان رائفل لئے رات تمام ان مقامات کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ بسا اوقات نوعمر کسان طالب علم جو ان تمام یونیورسٹیوں میں مشغول بکار رہتے ہیں راتوں کو یہ خدمت انجام دے کر بسر اوقات کے لئے معمولی مزدوری کما لیتے ہیں۔ اکثر مکانات میں جہاں کہیں آمد و رفت کے دو دو دروازے تھے اب ان میں سے ایک کو بند اور مقفل کر دیا گیا ہے۔ یہ سردی کے خوف سے نہیں۔ بلکہ چوروں کی ناپسندیدہ تشریف آوری کے انسداد کی خاطر۔ اسی احتیاط کے مدنظر۔ اور حفاظت کی خاطر جہاں کہیں دوسری

ایک کو بار خدمت سے سبکدوش کرکے مخفی زینہ کو زیر استعمال رکھا گیا تھا شاذ ہی زینے
شب میں روشن کئے جاتے ہوں گے۔ کیونکہ اسباب تعیش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلئے
قمقمے بہت زیادہ گران قیمت اور بہ آسانی دست برد ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان
کریہ کے مکانات و دوکانات کے اکثر رہنے والے بدامنی کے خوف سے ہر ایک کے لیے دروازہ
کھولنے ڈرتے ہیں۔ انہوں نے گھنٹیوں کی خاص تعداد مقرر کر رکھی ہے۔ اور ان اشارات
سے اپنے عزیز و اقارب و دوستوں کو آگاہ کر دیا ہے۔ تاکہ وہ غیر متوقع و ناپسندیدہ
ملاقاتیوں کے بے موقع داخلہ کا سدباب کر سکیں۔

دیہات میں بدامنی خوفناک طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ در بہ نسبت شہروں کے حالت
نہایت خطرناک ہے۔ وہاں کے جرائم کی نوعیت مثل جرائم از منہ وسطی وحشیانہ ہے
گھوڑوں کی چوری جسکا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ روزمرہ کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اور ڈاکہ
زنی بہت زیادہ شوق سب سواروں نے تو یوکرین (Ukraine) کا ملک کو
نہیں چھوڑا۔ البتہ اس جماعت کے اغراض سرقہ کے علاوہ کچھ سیاسی بھی تھے۔ مجھے
معلوم ہوا کہ اس گروہ کے بہت سے سرکاری دور سابق کے ذی رتبہ لوگ تھے۔ یہ گروہ
سابق عہدہ دار۔ وکلا۔ ڈاکٹر۔ ایکٹر۔ اور اسی قسم کے دیگر افراد پر مشتمل تھا۔
جو کہ فاقہ کشی، و دیگر مصائب سے تنگ آکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ ان
لوگوں نے خفیہ خبر رسانی کا انتظام معقول کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کے ایجنٹ شہروں میں
ہوتے تھے۔ جو ان کو بالشوکوں کی ریلوں سے نقل و حرکت کی اطلاعات دیتے تھے۔
یہ گروہ ان ریلوں کو راستوں میں روک کر۔ اور مسافرین میں سے بولشوکوں کو پہچان کر
قریب کے کسی جنگل میں ان بدقسمت سوشیلسٹ حضرات کا کام تمام کر دیتے تھے۔

اور ما بقی مسافرین کے اسباب تعیش اور قیمتی اشیاء چھین لیتے تھے۔
ایک مرتبہ مجھے بھی لینن گریڈ سے خیوا جانے کا اتفاق ہوا۔ جوں ہی ہماری

ریل گاڑی سرحد لوکرین پر پہونچی۔ سرخ فوجی دستہ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ایک بولشویک میرے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ اسکے ہمراہ کئی ایک ٹرنک کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے عزیز و اقارب کے لئے کر رہا تھا۔ اس جبر گو کو دیکھ کر مشوش سا ہوا۔ فوجی سپاہی مسافروں سے دریافت کرنے لگے کہ آیا کسی کے ہمراہ آلات آتشین بھی ہیں یا نہیں۔ کسی نے بھی اثبات میں جواب نہیں دیا۔

جوں ہی یہ سلسلۂ استفسار ختم ہو کر سپاہی چلے گئے اس بولشویک نے نہایت آہستہ سے کہا کہ اس کے ہمراہ ریوالور ہے۔ چونکہ اجازت نامہ پاس نہیں ہے۔ اس لئے اظہار حقیقت کی جرأت نہیں کر سکا۔ "تم نے بہت اچھا کیا جو یہ جواب دیا۔" مسافر ساتھی نے جواب میں کہا جن میں ان میں دوستی ہو گئی تھی۔" وہ لوگ اجازت ناموں کی تحقیقات نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اگر انکو معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں تمہارا نام لکھ لیتے۔ اور راستہ میں اگر ٹرین پر حملہ ہوتا تو تم کو بغرض امداد طلب کرتے۔"

قانون شکنی کے معمولی جرائم کی تعداد لاتعداد ہو چکی ہے۔ یہ مرض اسقدر عام ہو گیا ہے کہ کوئی دوسرا ملک روس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اور یہ حیرت انگیز واقعہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا میں نے اوپر ذکر کر چکا ہے۔ سوشیل حکومت لازمی طور پر پولیس کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اسی نام سے روسی نہایت آزادی سے اپنی حکومت کو خطاب بھی کرتے ہیں۔ افزائش دولت کی انفرادی کوششوں کو نہایت ہی میں محدود کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ حکومتی ادارات افزائش دولت کی کوششوں کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ تمام قوانین جو انفرادی کدوکاوش کی راہ میں کانٹے ڈالتے ہیں۔ بے حد شد و مد سے نافذ کئے جاتے ہیں اس پر طرفہ یہ کہ حکومت مفلوک الحال ہے۔ اور جمعبندی محصولات میں سہولت اور مہلت سے کام لینا اس کے لئے ناممکن ہے۔ اسی لئے حکومت تمام ... [illegible]

مجبور ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز کو قومی کر دیا گیا ہے۔ اور حکومت کی حیثیت ایک زبردست عظیم انسان زمیندار کی رہ گئی ہے۔ ڈکٹیٹر شپ کی روح فضا میں برسر عمل ہے۔

مقامی عہدہ دار عموماً اپنے خاص احکام جاری کر دیتے ہیں۔ اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ آیا وہ اس کے مجاز بھی ہیں یا نہیں اور ان کے یہ قوانین۔ قوانین سلطنت کے متضاد تو نہیں ہیں۔ اس سے بھی بڑھکر تعجب خیز یہ امر ہے کہ مقامی پولیس نہایت تشدد سے ان احکامات پر عمل پیرا ہونا بھی شروع کر دیتی ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ان مقامی مظالم کے دو نظائر ہیں۔ جن پر پولٹیکل اخبارات میں حال ہی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کئی ایک اشخاص کو عدم ادائی ٹکس کی پاداش میں جرمانہ کیا گیا۔ اور اون کی جائیدادیں بھی ضبط کر لیگئیں۔ یہ معاملہ یہیں ختم بھی نہیں ہوا۔ بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور ٹکس کی ادائی عمل میں نہیں آئی۔ جرمانہ کی شمار میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ عمل کئی بار ہوتا رہا۔ آخرکار مجرمین گرفتار کر لئے گئے۔

شروع سے آخر تک مقامی عہدہ داروں کا عمل بے رحمی و سختی پر مبنی تھا اور تعمیل کنندہ افسروں کو ان کا بھی حکم نادری نافذ ہوتا تھا کہ "دباؤ اور زیادہ ڈالو"

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مقامی محکمہ حفظان صحت نے پولیس کے متفق ہوکر ایک جامع قانون۔ خود مختارانہ طور پر جاری کر دیا۔ جس کے ذریعہ اس ضلع کے باشندوں پر لازم قرار دیا گیا۔ کہ وہ طویل فہرست اصول حفظان صحت کی پیروی کریں۔ ورنہ ایک سو روبل جرمانہ خاص کو ادا کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ مکانات کے صحن میں بیت الخلاء تعمیر کرائیں۔ اور کوڑا کرکٹ جمع کرنے ایک علیحدہ جگہ مقرر کر دیں۔ اور مکانات کے اندر اوگالدان اور کچرا جمع کرنے کے ٹوکرے رکھیں۔ بینچ جن پر

بہی بھی

وگ سوتے ہیں۔ اون کو روزانہ صبح گیلے کپڑے سے پونچا کریں۔ تاکہ کھٹمل پسو وغیرہ ۔
نہ ہونے پائیں ۔ چھتوں اور دیواروں کو پانی و سوڈے سے بہ پابندی اوقات مقررہ
دھویا کریں۔ اس میں شک نہیں اس قانون میں مفید باتیں بھی ہیں ۔ لیکن اس
سے نہ صرف روسیوں کی معاشرت۔ بلکہ ان لوگوں کی ذہنیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔
اور حاکم و محکوم کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

تمام حکام ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سخت ہیں۔ اور یہ روسیوں کا خاصہ ہے کہ ذرا
سا بھی اقتدار جب انہیں ملجاتا ہے تو یہ وحشتناک طور پر ظالم و جابر ہو جاتے ہیں
اور یہ واقعہ ہے کہ کسی دوسری حکومت کا حکمران طبقہ اتنا سخت و جابر نہیں ہوتا ہے ۔
ماسوا انقلاب کے ساتھ۔ فلاکت و پست ہمتی کی وبا بھی آئی۔ انقلاب کے
بعد اس کا ظہور پذیر ہونا لازمی ہے ۔عوام پر اسکا تباہ کن اثر مترتب ہوا ۔کیونکہ وہ
صدیوں شاہی حکومت کی بدولت۔ اوّل ہی کمزور و محتاج ہو چکے تھے ۔پست ہمتی
کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کا رجحان ایام گزاری کی طرف مائل ہوا۔ وہ بجائے اصلاح
و تعمیر کے جیسا بھی ہو دن گزارنے کی سوچنے لگے حتیٰ کے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی
اصلاح و ترقی کی روح معدوم ہوگئی اور وہ بھی ابنائے جنس کی طرح بے حس تھا
ان حالات میں ڈکٹیٹر شپ کے قوانین و ضوابط کو جو ایک سوشل حکومت کے سنگ بنیاد
ہوتے ہیں۔ بہت دقتوں و دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حیرت انگیز امر نہیں
ہر سال محکمہ فوجداری میں صرف (۲۰) لاکھ مقدمات کی سماعت ہوتی ہے اور اس
کے علاوہ جرم کا معتدبہ حصہ عموماً قصبات میں یوں ہی پولیس کی نظروں سے پوشیدہ
رہ کر رفت و گزشت ہو جاتا ہے ۔ یہاں اس امر کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ جو فعل
روس میں جرم تصور کیا جاتا ہے ۔ وہ ضرور نہیں کہ ہر ملک میں بھی جرم ہی خیال کیا جاتا ہو
کیونکہ وہاں حکومت ۔ ہر ایک انسانی فعل پر نگرانی رکھنا چاہتی ہے۔ اور یہ اس کا

مطمح نظر ہے کہ ہر ایک باشندہ کلیتہً اس کے حکم کے زیر اثر اور اس کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ اس حکومت کا سابقہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے۔ جو مطلق نہیں جانتے کہ اسٹیٹ یا حکومت کیا شئی ہے۔ لہٰذا تمام جیل خانے بھرے پڑے ہیں۔ بازاروں میں مونا لوگوں کی مجمع اور جمگھٹ نظر آتے ہیں۔ جو اپنے عزیزوں سے جیل نا نونس ملاقات کرنے کے، انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ جیل خانوں میں۔ ہلینفے کے لوگ مقید ہیں۔ جیسا کہ میں اسکے قبل بیان کر چکا ہوں۔

یوشوتیکسوں کا اثر بہت وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے میں نے کئی ایک جیل خانو کی سیر کی اور صدر محکمہ جیل نے میری رہبری کی تھی۔ وہ یہودی المذہب اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی داڑھی چھوٹی اور سیاہ تھی۔ اور سونے کی عینک زیب چشم۔ اس کی ہر حرکت سے تیزی و پھرتی ظاہر ہوتی تھی۔ اور آنکھوں سے فراست و دانشمندی چمک رہی تھی۔ اور دل میں التفات و مہربانی کی جھلک بھی موجود تھی۔ وہ ایک پرجوش انسان تھا۔ اس کا مددگار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ لیکن میں اس کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا۔ وہ ایک موٹا تازہ آدمی تھا۔ داڑھی مونچھ صفاچٹ۔ اور میرے ساتھ برتاؤ میں نہایت شستہ اور مہذب۔ لیکن میں اس کو شریر النفس خیال کرتا ہوں۔

ہم ایک گاڑی میں روانہ ہوئے۔ پہلے اس دن ہم کی جیل خانے (Sramoninsky prism) گئے۔ جو کہ زمانہ سابق میں خانقاہ تھا متعدد مذہبی رنگین تصاویر ابتر حالت میں نظر آئیں جو ایک جا جمع کر دئے گئے تھے۔ اور انکی جگہ لینن کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جہاں سے تمام مذہبی مقدس چیزیں نکال لے جاکر اس کو مطالعہ گھر بنا دیا گیا تھا۔ قیدی بیکار اوقات میں ان قید خانوں میں رہتے تھے۔ جو کہ کسی زمانے میں راہبوں کا فرودگاہ تھے۔ ہر ایک کمرے

میں چار پانچ آدمیوں کو رکھا گیا تھا۔ اس قسم کی غیر متوقع رعایت ایک ایسے ملک میں۔ جہاں کہ اصول حفظان صحت میں خاصی واقفیت ہو مشتبہ ضرور ہے قیدیوں کو اپنے ذاتی لباس پہننے۔ اخبارات پڑھنے کے بعد آپس میں آزادی سے بات چیت کرنے کی اجازت تھی۔ دن میں ان سے مختلف مفید کام لئے جاتے تھے۔ مثلاً کفدوزی سنہاری نجاری۔ مطبع میں مشقت۔ اور اس کے معاوضہ میں انہیں نہایت قلیل اُجرت بعد وضع اخراجات خورد و نوش دیجاتی تھی۔ ان کی اپنی خاص ٹریڈ یونین بھی تھی۔ اور ایک مدرسہ بھی تھا۔ جس میں متنوع سیاسی نصاب شریک تعلیم کیا گیا تھا اور مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ ادبی۔ و موسیقی کے سوسائٹیاں بھی ان کے لئے قائم کی گئیں تھیں۔

قیدخانوں کے دروازوں کو بولٹ اور سنکل وغیرہ نہیں تھے۔ شاید جیل خانے کے دروازے شب میں بند کر دئے جاتے ہوں۔

جیلر معمولی لباس پہنتے تھے۔ ان میں اور قیدیوں میں شناخت کرنا دشوار تھا۔ قیدیوں کو فرار نہ ہونے دینے کی وہ حد تدبیر یہ کی گئی تھی کہ اندرون دیوار سنتری مقررہ فاصلے پر اس طرح متعین کر دئے گئے تھے ان کا ایک دایرہ قایم ہو جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی جیل خانہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا تھا۔ جیل خانہ کی حالت بظاہر بہت زیادہ ایک کارخانہ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اور اس پر جیل خانہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کہنا تو یقیناً دشوار ہے کہ یہاں کے مقیم اشخاص خوش و خرم تھے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام دلکش و دلچسپ ہے۔ قیدیوں کو اپنے خانگی پوشاک میں ملبس رہنے کی اجازت البتہ ان کے لئے باعث طمانیت تھی۔ اُن کی حالت ایک میلے بد وضع لباس پوش مجمع کے مانند تھی۔ اور یہ کوئی حیرت انگیز امر بھی نہیں ہے کہ دیگر ممالک کے باشندے۔ حتیٰ کہ آزاد ممالک کے بھی عمدہ لباس زیب تن

کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس خانقاہ کی عمارت بھی بد وضع و غلیظ معلوم ہو رہی تھی۔ اور انقلاب سے اب تک اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں کیا گیا تھا۔

دوسرے جیل خانوں کو جاتے ہوئے میں نے اپنے ساتھیوں سے سلسلۂ کلام شروع کیا۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ اوس میں قیدی تین طبقوں میں منقسم کئے گئے ہیں۔ اولاً (۱) وہ جو ہنوز زیر تحقیقات ہیں اور جن کے نیک رویہ و نیک خیال ہونے کے متعلق یقین نہیں کیا جا سکتا۔ (۲) وہ جو تحقیقات میں نیک و شریف انسان ثابت ہوئے۔ ان کو ہر سال ایک ہفتہ کی اجازت دیجاتی ہے کہ اپنے عزیز و اقارب سے مل آئیں۔ اور (۳) وہ جو قطعی مہذب و تمام انتبار شریف انسان ثابت ہو گئے ہیں۔ ان کو دو ہفتے کی اجازت اپنے خویش و اقربا سے ملنے کی سالانہ دیجاتی ہے ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض قیدی جن کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ عہد شکنی کی۔ اور وہ واپس نہیں آئے۔

"مجموعی طور پر کل مملکت روس میں کتنے آدمی مقید ہیں"۔؟ میں نے دریافت کیا۔ "اسی ہزار (۸۰۰۰۰)" جواب ملا کل اقسام کے قیدیوں کی یہ تعداد ہے۔ اور سیاسی قیدی ان میں شامل نہیں۔؟ اس پر مجھ کو اس امر کا یقین دلایا گیا کہ یہ مجموعی تعداد ہے "کیا قصداً خودکشی کرنا روس میں جرم تصور کیا جاتا ہے۔"؟ میں نے سوال کیا۔ جواب ملا کہ نہیں۔ خودکشی جرم نہیں ہے۔

اس اثنا میں ہماری نظر ایک کہنہ سیاہی مائل زرد گنبد پر پڑی۔ جس پر سنہرے تارے بکھرے ہوئے چمک رہے تھے۔ یہ گنبد "تگنکی خانقاہ (Taganoky monastery)" کا تھا۔ جس سے زنانے جیل خانہ کا کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں بھی انتظام کی حالت درست نہ تھی۔ اور اس کی کیفیت بالکل مردانے جیل خانہ سے ملتی جلتی تھی جس کو کہ ابھی ہم دیکھ آئے تھے۔ ایک وسیع کمرے میں مختلف عمر کی عورتوں کو بھر دیا گیا تھا۔ جن کے منہ ڈھکے

سے موٹے بکرار ہے تھے۔ سرخ افواج کے ملبوسات سیناان کا کام تھا۔ عورتیں سروں پر شال ڈالے گروہ درگروہ ادہر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اس جگہ عجیب آزادی و آرام کی جھلک نمایاں تھی۔ جو ہر اجنبی پر اسکا اثر ہو جاتا تھا۔

صدر محابس کو سبھوں نے پہچان لیا۔ اور درخواست گذاروں کا مجمع اس کے اطراف جمع ہو گیا۔ اس کا برتاؤ بھی ان عورتوں کے ساتھ بالکل ہی سیدھا سادھا تھا۔

"میں کم محنت۔ اور زاید اجرت کی طلبگار ہوں" ایک نے کہا۔

میں ضمانت پر ہوں۔ لیکن مجھ سے ایسا ہی کام لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ دوسروں سے۔" دوسری کی شکایت تھی۔ اور تیسری کا یہ فیصلہ تھا کہ "میں عہد حکومت زار میں کئی بار جیل خانہ میں رہ چکی ہوں۔ اور سویٹ روس کے جیل خانوں کو میں بدرجہا بہتر و پسندیدہ خیال کرتی ہوں"

جب ہم اس خانقاہ سے روانہ ہوئے۔ اس کے چرچ کے صحن میں سے ہمارا گذر ہوا۔ اس گنبد کے پتھروں سے پیوستہ مورتیں دکھائی دیں۔ اور ایک مرتبہ پھر انقلاب دہر کا نقشہ میرے نظروں کے سامنے سے گذر گیا۔

"کیا یہ سب سے بدترین جیل خانے آپ نے مجھے بتلائے ہیں، یا اس سے بھی سخت یہاں کوئی اور شئی ہے" ؟ میں مستفسر ہوا۔ اس پر دونوں میں تھوڑی دیر تک باہم مشورہ ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد ہم موٹر میں سوار ہوئے۔ ہماری منتظر ٹھیری ہوئی تھی۔ اور جیل خانہ "اسکولینی کی (Skolniki") کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ ایک وسیع سرخ اینٹ کی عمارت تھی۔ جس کو عہد حکومت زار میں، جیل خانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں کا انتظام بہ نسبت اور جیل خانوں کے سخت پایا گیا۔ جیلر یونیفارم پہنے ہوئے باہتیار تھے۔ اور جب ہم ایک وارڈ سے دوسرے،

وارڈ کو جاتے تھے۔ وہ لوگ جو اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ صدر مجلس کے قریب آتے زاایڑی سے ایڑھی ملاکر اس کو باضابطہ فوجی سلام کرتے۔ اور اپنے وارڈ کے قیدیوں کی تعداد اور اون کے چال وچلن کی رپورٹ۔ زبانی اس کو دیتے تھے۔ دن میں یہاں کے قیدی مختلف کام کرتے تھے۔ مثلاً۔ اوزان بنانا۔ صندوق تیار کرنا۔ جوتے سینا کپڑے سینا وغیرہ۔ رات میں یہ لوگ کئی کئی الگ حجرت میں سوتے تھے۔ لیکن یہ حجرے واقعی جیل خانے کے حجرے تھے۔ ان کو بوالسٹ بکل وغیرہ سب کچھ موجود تھے " بالالیکا ارچیسٹرا" (Balalika Orchestra) اور جماعت مغنی یہاں بھی قایم تھی۔ یہ دونوں کے کھیل میرے سامنے کئے گئے " ارچیسٹرا" میں بین الاقوامی ترانہ بہت جوش سے گایا گیا۔ اس وقت تمام حاضرین کا اوباٹھڑا ہو جانا عجیب پُراثر منظر پیش کر رہا تھا۔ جماعت مغنیہ بھی اعلیٰ درجے کی تھی ایک نوعمر باکمال مغنی نہایت سریلی آواز سے یوکرین نظم گایا۔ اس کا ٹیپ بند نہایت موزوں اس ماحول کے بالکل مناسب حال تھا۔ اور آخر میں بالالیکا ارچیسٹرا۔ کا اختتام روسی وحشی ناچ پر ہوا۔ اور سب سے آخر میں ہمارا سب قیدیوں کے ساتھ فوٹو لیا گیا۔ یہ کیوں؟ مجھے معلوم نہیں

مجھ سے کہا گیا کہ ان قیدیوں سے کچھ سوالات کروں۔ لیکن مجھے علم تھا کہ اس قسم کی اجازت قطعاً مہمل ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ انتہا درجہ واقعی عبث ہے کہ یہ قیدی اپنے شکایات ایک اجنبی سے بیان کریں گے۔ اور وہ بھی ان حضرات کے بالمشافہ جن کے زیر نگرانی یہ مقید ہیں۔ اور جن کے قسمت کی باگ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔

مجھے یاد ہے جب ہم ایک کمرے میں گذررہے تھے ایک روسی زمین پر دراز پایا گیا۔ اور کئی ایک وارڈر گھیرے ہوئے۔ اس کو اٹھنے پر مجبور کر رہے تھے۔

عین اسی وقت میرے ساتھیوں نے اپنے قدم تیز کئے۔ میں نے اس واقعہ پر زور
دیا۔ لیکن یہ بولشویک عہدہ دار جو مجھے یہ باور کرانے کی کاوش میں تھے کہ ان کے
جیل خانے روسیت اور وحشی نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت مناسب اصول پر ان کو رکھا
گیا ہے۔ ان کی یہ خواہش قدرتی خواہش تھی۔ وہ اس واقعہ سے چین بچین
ضرور ہوئے۔ کیونکہ ان کا کیا کرایا کام اس سے خراب ہو گیا۔ مجھے اس امر کا
یقین واثق ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ برتاؤ سمجھ بوجھ کر کرتے ہیں۔ جو
ان کے اقتدار۔ وحکومت کے خلاف چیلنج نہیں دیتے سختیاں صرف انہی
کے لئے ہیں۔ جو باغی ہیں۔ اور میں اس سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ مجھے صرف
وہی جیل خانے بتلائے گئے۔ جو اجنبیوں کو بتلائے جانے کے لائق تھے۔ میں نے
ایسے بہت سے اشخاص سے گفتگو کی ہے۔ جو ماسکو میں مقید رہ چکے تھے۔ اور ایسوں
سے بھی جن کو اس ساعت نحس کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر و
بیشتر تعلیم یافتہ روسی۔ جنکا تعلق کمیونسٹ۔ جماعت سے ہیں۔ کسی نہ کسی
وقت گرفتار۔ وقید ضرور ہوئے تھے۔ "جب کہ میں قید میں تھا" ایک عام
جملہ ہے۔ جو کہ ماسکو اور دوسرے مقامات میں اکثر و بیشتر اشخاص کے ورد زبان
ہے۔ لیکن بیشتر اشخاص جو اس کا تجربہ اٹھا چکے ہیں۔ ان کو قید کی سختیوں
کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن میں نے ان جیل خانوں کی نسبت قطعاً
مختلف کیفیتیں سنیں۔ جو کہ انتہائی شمالی حصے سائبریا، میں پوشیدہ ہیں۔ اور
ان مقامات پر وہ روح فرسا مظالم۔ جن کا وجود عہد زار سے چلا آرہا ہے۔ زیر
عمل لائے جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ ٹالسٹائے نے اپنی کتاب ریسیر
کشن (Resurrection) میں تحریر کیا ہے۔ یہ افواہیں ان کیفیتوں کے
عین مطابق پائی گئیں، جو کہ مختلف بدنصیب، مصیبت زدہ لوگوں کے ذریعہ سے

لندن تک پہونچی ہیں مجھے ان دو زیادہ جیل خانوں دیکھنے کی اجازت
نہیں دی گئی۔ اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں آج تک کسی ہندی وفد نے بھی
ان مقامات کا معائنہ نہیں کیا۔ نہ جماعت مزدوران ... بماعت
کو اس کا موقع ملا۔ فقط

فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الاَبْصَار

مترجم
"راز"

موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں۔ بے فکری کا زمانہ، پڑھنے لکھنے سے فرصت ملی تو سیر و
تفریح کی سوجھنے لگی۔ یار آشناؤں نے مل کر سوچنا شروع کیا کہ آنے والی چھٹیوں کے
دن سے سامان مہیا ہوں۔ جن سے یہ پہاڑ سے دن ہنستے بولتے کٹ جائیں۔ سب
دوستوں نے مل کر رائے زنی شروع کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ "ٹھنڈی پہاڑی کی طرف
بہت اچھی ہے۔ وہاں چل کر کچھ دن رہنا چاہیے۔" مگر کسی نے بھی ان کی تائید
نہیں کی۔ اور وہ سب جھینک کر خاموش ہو رہے۔ ایک دوسرے صاحب نے فرمایا،
ذہن لڑ گیا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ کہیں شکار کو جانا چاہیے۔ یہ تجویز پسندیدگی
کی نظر سے دیکھی گئی۔ مگر مشکل یہ پڑی کہ آخر جائیں تو کہاں جائیں۔ ایک نے کہا
کہ عادل آباد میں شکار کی کثرت ہے۔ مگر دوسرے نے یہ کہہ کر ان کا گلا دبایا کہ وہاں
آدم خوار شیر و چیتے کی بھی کثرت ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے ڈرتے ڈرتے راکھور کا نام لیا

بتّے وہیں ذہانت بتائی کہ واہ اس طرف پانی کی قلّت ہے۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ اشفاق
حسین صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک نہایت ہی متین، اور سنجیدہ آدمی مانے
جاتے ہیں۔ مگر اس خاکسار کی رائے میں ذرا طبیعت کے تیز ہیں کوئی بات خلافِ
مزاج ہوئی تو بگڑ کھڑے ہوئے ہیں اور اس طرح بگڑتے ہیں کہ دیدۂ دل تک کو
شرم آ جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ روپے پیسے کے معاملہ میں ذرا محتاط ہیں۔ اور اگر
فدوی سے پوچھئے ہو تو انکی یہ احتیاط بخالت کی حد تک پہنچتی ہے۔ اتنا اٹھنا تھا کہ سب
ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کہنا شروع کیا کہ میرا ایک مقطعہ ہے۔ وہاں
کیوں نہ چلو۔ کچھ ایسی دور بھی نہیں۔ صرف تین گھنٹہ کا سفر ہے۔ جگہ بھی اچھی ہے۔
پتے وستان اچھا ہے۔ اور شکار کی تو اسقدر کثرت ہے کہ جانور بندوق کی نالی
پر آ آ کر گرتے ہیں۔ یہ سن کر سب کے سب پھڑک اٹھے۔ اور یہ تحریک بلا کسی اعتراض کے
منظور کی گئی۔

اب سامانِ سفر کے متعلق گفت و شنید شروع ہوئی۔ ہم نے کہا کہ ہر شخص
کے ساتھ ایک چھوٹے صندوق اور ایک بستر کے سوا کوئی دوسرا سامان نہ ہو۔ سب
اس پر راضی ہو گئے۔ بندوق پر جھگڑا آ پڑا۔ کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ بندوق تو کیا
ایک کارتوس بھی نہ تھا۔ اور لطف یہ کہ شکار کھیلنے پر سب تلے ہوئے تھے۔ اشفاق
حسین ہی نے ایک عدد بندوق دینے کا ذمہ لیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ چند جملے اپنے
آلۂ قتل و غارت کی تعریف میں کہے۔ اور یہ بھی کہا کہ سارے دکن میں شاید ہی کوئی
اور بندوق اس کی ٹکر کی نکل آئے۔ ہم نے اپنے دل کو مخاطب کر کے کہا کہ اے دل!
دیکھ تو بھی دنیا میں ایسے لوگ بستے ہیں جنہیں مجمع عام میں اس قدر سچ جھوٹ
بولتے کچھ باک نہیں۔ یہ سنکر ہمارے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ اور
ہم نے اس خوف سے کہ کہیں پارہ سیماب باہر نہ نکل پڑے۔ اپنی توجہ دوسری

جانب منعطف کرلی۔

تاریخ روانگی کے متعلق طویل مباحثے ہوئے۔ آخر ایک صاحب نے جنہیں نجومی ہونے کا عرصہ باطل ہے۔ انگلیوں پر کچھ شمار کر کے حکم لگایا کہ ہفتہ کا دن روز سعید ہے۔ اسی دن چلنا چاہیئے۔ بعض احباب اس کے مخالف تھے۔ مگر نجومی کے آگے، ہمارا کوئی چارہ نہیں ہے۔ نہیں اچھی ہوتے ہی بن پڑی۔ ہم نے اٹھ کر اعلان کر دیا کہ ہفتے کے دن صبح ساڑھے چھ بجے ہر شخص کو اسٹیشن پر موجود رہنا چاہئے۔ اس کے بعد تیاری کا روائی موقوف کی گئی۔ اور تمام احباب تہیۂ سفر کی فکر میں اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے۔

ہفتے کو علی الصباح ہماری آنکھ کھل گئی۔ ہم نے اٹھ کر بستر باندھ لیا۔ اور منہ ہاتھ دھو کر آنا فانا تیار ہو گیا کہ گویا آئندہ کچھ اور کرنے کی امید نہیں۔ نوکر کو چند ضروری ہدایتیں کیں۔ اور گھر میں گھس کر بڑی بوڑھی عورتوں کو اس امید سے سلام کرنے شروع کئے۔ کہ شاید امام ضامن کے کچھ روپیہ ہاتھ لگ جائیں۔ مگر ان بیبیوں نے صرف دعاؤں ہی پر ٹال دیا۔ اور ہمارا جھک جھک کر سلام کرنا بے سود رہا۔

گھر سے نکل کر لمبے لمبے پاؤں مارتے اسٹیشن پہونچے۔ وہاں کسی کو بھی نہ پایا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ہم نے پلیٹ فارم پر چہل قدمی شروع کی۔ ایک ایک کر کے احباب آنے شروع ہوئے۔ اور تھوڑی دیر میں سارے کے سارے موجود ہوئے۔ اشفاق حسین سب سے پیچھے آئے۔ اور بندوق بھی ساتھ لیتے آئے۔ اس بندوق کی کیا تعریف کروں۔ اس کی نالی زلف معشوق کی طرح خمدار۔ اس کا دیدبان دہنِ معشوق کی طرح ناپید۔ اور اس کا کندہ سینۂ عاشق کی طرح فگار تھا۔ تھی تو ہتھیار مگر حسینوں کی ساری نزاکتیں اس میں موجود تھیں۔ دیکھنے میں یہ حال تھا۔ اور جب چلتی ہو گی تو کبک دری بھی اپنی خرام ناز بھول جاتا

بے نہ داستانی کہ الاماں ۔

غرض وہ دن تو جوں توں گذر ہی گیا۔ مگر رات کو سونے کے لئے جب کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ جگہ بہت چھوٹی ہے۔ اور سونے والے دس بارہ آدمی۔ پہلے اہماری آنکھوں کے سامنے قلعہ والی کوٹھری کا غلط واقعہ بیان ہوگیا۔ لیکن کر کیا سکتے تھے۔ تہ و درویش بر جان درویش۔ بیٹھ سا بنا پڑے رہے۔

دوسرے دن تڑکے ہی سے اشفاق حسین اٹھ بیٹھے۔ اور ہم سب کو بھی جگا دیا۔ اور کہنے لگے کہ شکار کھیلنے کا یہی وقت ہے۔ یہ کہہ کر اپنی یکتائے عصر بندوق اٹھائی۔ اور چل پڑے۔ سب کے سب ان کے ساتھ ہو لئے۔ بھلا ایک ویرانے میں شکار کیا ہاتھ آسکتا تھا۔ میلوں تک کو دیکھ ڈالا۔ مگر ایک چڑیا تک تو نظر نہ آئی۔

حسن اتفاق تو دیکھئے کہ یہ شکاریوں کی جماعت بے نیل ومرام واپس ہو رہی تھی کہ گھر کے قریب ہی ایک املی کے درخت پر فاختہ کا جوڑا ہماری نظر پڑا۔ ہم نے فوراً اشفاق حسین کو اس طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور ہم سب کو خاموش رہنے کی تاکید کر کے۔ دبتے دبتے درخت کے نیچے پہونچے۔ وہاں پہونچکر بندوق قاعدے سے کندھے پر لگائی۔ اور تقریباً پانچ منٹ تک نشانہ لیتے رہے۔ ہم تو سمجھے کہ شاید دن بھر اسی طرح نشانہ لیتے رہینگے۔ مگر نہیں۔ دھڑم سے ایک آواز ہوئی۔ اور ادھر فاختہ کا جوڑا ہوا میں بلند ہو کر غائب ہوگیا دھر اشفاق حسین پیچھے قدم لڑکتے آئے۔ اور دیکھتے کے دیکھتے چاروں خانے چت گر پڑے۔

ہم نے ایسا تماشا زندگی بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ زور سے تالی بجاویں۔ مگر موقع ذرا بے ڈھب تھا۔ اشفاق حسین کی صورت تو دیکھنے سے

تعلق رکھتی تھی۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اور وہ اس طرح ہانپ رہے تھے۔ جیسے کسی نے ان پر بندوق چلائی ہے۔ احباب کی زبان کون پکڑ سکتا تھا۔ دو چار فقرے کس ہی گئے۔ اب کیا تھا ایک تو شکست کھانے کا غم۔ دوسرے ہرنے کا ملال۔ تیسرے یہ چبھتے ہوئے فقرے۔

انھوں نے اٹھ کر لڑنا شروع کیا۔ ہم نے اپنے دونوں ہاتھ انگلیاں دانت ہیں۔ اور دوڑ کر بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ وہ سمجھا بجھا کر ہوٹل لے آئے۔

گھر پہونچکر سبھوں کی رائے ہوئی کہ یہاں سے کنارہ کشی زیادہ مناسب ہے۔ واپس چلنا چاہئے۔ چنانچہ شام کو گاڑی سے واپسی عمل میں آئی۔

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر شائقین قدرت و ... ہیں تو۔ بندوق اور قطعہ بھیکر دوستوں کی دعوت کر دیں گے تاکہ تلافی ہو جائے۔ فقط

سید مسعود احمد رضوی

مثنوی گلشن عشق سلسلہ گذشتہ

از جناب آغا حیدر حسن صاحب

دلاں تو تجہ پنجے کے شہباز کوں
کھڑک شاہ پر تیز پرواز کوں

دھنی تو تجہ ہے مسجد و دیر کا
تہیں ہے سبب صلح ہور بیر کا

تیرے دھیاں دایم رہے دل میں پور
جتا جن و انسان و وحش و طیور

کہنے کٹہ سکے حمد تجہ بے شمار
کہ دریا کوں کوئی تیر جاتا ہے پار

کہ تجہ نکہ صفت تے نہوئی یک رتی
اپنا کر مناجات اے نصرتی

از نعت علی نامہ

تہیں اے شہنشاہ دنیا و دیں
شجاعت کی تے صف کا اینی شیں

شرف توں دلیری کے تجہ سینہ صدر
دیا ہات پکڑ تیغ تو تو تجہ قدر

تیرے کاج جس حق نے پیدا کیا
غزا کا شرف توں سوں پیدا کیا

تیرا دبدبہ دیکھ خوش دہات کا
زمیں پر نتھا رہا قدم لات کا

تیرا نور بے مثل گوہر کا آب
تیرا مدح نے شب گل کا گلاب

منقبت شاہ ولایت علیہ السلام

زہے بیشۂ لا مکاں کا دلیر | علی ولی تو خدا کا ہے شیر
ولایت کا وہ درخت سے توں سایہ دار | کہ ہر شاخ پر ہے نبوت کی بار
محباں کے دل میں تیرا حب یقیں | جنم جگ ہے ایماں کوں حصن حصیں
تو یک کوٹ ہے برج جسکے تمام | او بارہ اماماں علیہ السلام

ہوا جب سوں تیرا حصار استوار
زمیں پائیداری سوں ہوئی برقرار

علی عادل شاہ کی مدح میں

لکھوں اپنا مدح شاہ زماں | کہ ثانی سکندر ہے صاحبقراں
قلم آج جو مجہہ جہانگیر ہے | صفت شاہ کی لکھنے کی تاثیر ہے
زہے شاہ عادل سہی ولی | علی ابن سلطان محمد بلی
جو میں ورد تجہہ اسم اعظم کیا | بچن سوں مسخر یو عالم کیا
دکھن نت ہے اس فخر سوں باغ باغ | کہ تس گھر ہے تجہہ سا گہر شب چراغ
ہر یک دیپ تجہہ دیپ آنا ضرور | کہ سب ملک اندہارا دکھن پر ہے نور
تیرا چتر خورشید کا سایہ بان | منگے تجہہ علم کا پناہ آسماں

دکھن کے اتھے کیا بلند آج بخت
کہ جاں توں ہوا شہ خداوند تخت

تاریخ پنالہ

وہیں یو فتح کی تاریخ نصرتی بولیا | علی نے پل میں پنالہ لئے صلاں

قصیدہ مدحیہ

اے شہ تو ہے ہمنام علی | شاہاں پہ تیری سروری
والدل فلک کا رام تجھ | کرتا زمانہ قنبری۔

مذمت طمع:-

طمع اہل عزت کو کرتی ہے خوار | کرے جگ میں بے قول بے اعتبار
طمع نام و ناموس کا کال ہے | طمع جیو کوں سکھ کے بھونچال ہے
طمع مرد آزاد کوں بند جاں | طمع تیجہ ہوئے دین دنیا کوں نقصاں
طمع بخت لے چھین ہوندا کرے | طمع ساؤ کوں نت کلونڈا کرے

طمع یار سوں ناموافق دسا آئے
مسلمان کوں ناموافق دسا آئے

اشعار برخاتمہ علی نامہ

سخن کا بڑا قدر ہے شہ کے پاس | کہ جوہر پرکتا ہے جوہر شناس
کیا ہوں سخن مختصر بے گماں | کہ تو شاہنامہ دکن کا ہے جاں

مندرجہ ذیل حالات۔ گارسین دی تاسی کی کتاب "تاریخ ہندستانی ادب"
(ہستوار دی لالت رے تیور ہندوی)
کی جلد ثانی صفحہ (۵۴۸ تا ۵۸۴) مطبوعہ ۱۸۷۰ء سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔

نواب مسعود جنگ بہادر کا احسان ہے کہ انہوں نے اپنے بیش بہا اوقات میں سے اسکے ترجمہ کرنے میں صرف کئے۔ نواب صاحب موصوف کو فرانسیسی کا انگریزی ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ فرانسیسی کتب کا اسطرح انگریزی میں روانی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والیکو گمان ہوتا ہے کہ وہ کوئی انگریزی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ نواب صاحب کے اس انگریزی ترجمہ کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے ملاحظہ ہو:۔

" نصرتی دکھن کے مشہور لکھنے والوں میں سے ہے۔ یہ سولھویں صدی کے وسط میں گذرا ہے۔ اسکی تصنیفات مندرجۂ ذیل ہیں:۔

(۱) گلشن عشق۔ سورج بھان کے بیٹے کنور منوہر اور مدمالتی کا قصہ ہے۔ اس کے چند نسخے دفتر " مشرقی ہند " (ایسٹ انڈیا آفس) میں ہیں۔ اور دوسرے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ کلکتہ کی انجمن ایشیائی (ایشیاٹک سوسائیٹی کلکتہ) میں ایک نسخہ ہے جس میں رنگین تصویریں ہیں:۔

میرے خیال میں منوہر اور مدمالتی کے قصے دوسرے ہندوستانی مصنفین نے بھی لکھے ہیں۔ (حضور) نظام (خلد اللہ ملکہ) کے کتب خانہ واقع حیدرآباد میں ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس کا نام " منوہر مادھو مالتی " ہے۔ یہ دکنی زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصہ نہیں ہے جو نصرتی نے " گلشن عشق " کے نام سے لکھا ہے اس مؤخر الذکر نسخہ کے علاوہ دفتر مشرقی ہند میں اور کئی نسخے ہیں جنکا موضوع بھی ہے۔ اور نام بھی۔ " قصۂ منوہر کنور اور مدھو مالتی " ہے۔ ان میں سے ایک پانسو صفحہ کا ہے اور دکنی زبان میں ہے۔ وارڈ نے ایک اور نسخے کا ذکر کیا ہے۔ جسکا نام " مادھو مالتی ہے اور جیپوری بولی میں لکھا گیا ہے۔ اس فنا کا بھی وہی موضوع ہے۔ میکنزی نے جو کتابیں جمع کی ہیں۔ ان میں بھی ایک نسخہ ہے۔ جسکا نام " قصۂ مادھو مالتی " ہے۔

اکے مصرعے فارسی اور ہندوستانی مے جلے ہیں۔

میں ہے۔ واٹن نے میکنیزی کی بیش قیمت کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے۔ اس میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ ہندو اعمل کی کتاب ہے۔

(۲) گلدستۂ عشق"۔ اسکے دکھنی اشعار کا مجموعہ ہے۔

(۳) علی نامہ۔ یا تاریخ علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور"۔ یہ مثنوی بہت ضخیم ہے۔ اور اس میں وہ قصیدے اور دوسری نظمیں بھی ہیں جو ان تاریخی واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جنکا تذکرہ اس کتاب میں ہوا ہے۔ دفتر مشرقی ہند کے کتب خانہ میں اس کا خط نسق میں لکھا ہوا نسخہ بہت اچھی حالت میں موجود ہے۔ اگر ھـــہ کاپی (کاپی ورم) میں لکھے گئے نسخہ پر یقین کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی ذات کا برہمن تھا۔

"نصرتی" علی عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے علی عادل شاہ کے نام پر وہ مثنوی جو اس نے سنہ ۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں لکھی ہے معنون کی ہے۔ بنگال کی انجمن ایشیائی میں جو نسخہ ہے اس کا عدد شمار (۲۰۴) ہے۔ اس میں سترہ سطری دو سو اسی ۲۸۰ صفحہ ہیں۔ میرے ذاتی مقبوضہ میں میں نو سطری دو سو ارسٹھ ۲۶۸ صفحہ ہیں یہ مرزا علی چشتی نے سنہ ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۸ء میں لکھا تھا۔

عاقل خان رازی (دہلوی) نے بھی منوہر و مدمالتی کے قصہ کو فارسی میں سنہ ۱۰۶۵ھ میں منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کا نام مہر و ماہ ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :۔

حدیث روش دلخواہ گویم ؎ سخن از عشق مہر و ماہ گویم
کنم عشق منوہر را کتابے ؎ دھمہ از نام مہر آنرا خطابے
نوائے حسن مدمالت سرایم ؎ دے از پردۂ ماہش نمایم

رازی نے اسکی تاریخ کہی ہے ملاحظہ ہو:۔

زہجرت یکہزار و شصت و پنج است | کزیں عنم خانۂ طبعم نکتہ سنج است
چوں سن ایں داستان از غم زدم دم | بخواں تاریخ آں دیباچۂ غم
۱۰۶۵ھ

چونکہ گلشنِ عشق سے تین سال پہلے مثنوی مہر و ماہ تصنیف ہوئی تھی۔ اس لیے خافی خاں نے ملا نصرتی کی گلشنِ عشق کو مہر و ماہ کا ترجمہ جانا۔

منتخب اللباب جلد سوم صفحہ ۳۶۰، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ملاحظہ فرمائیے

خافی خاں جب علی عادل شاہ ثانی والئ بیجاپور کی ہندی شعرا نوازی کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ضمن میں جو کہ جاتا ہے اسکا اردو ترجمہ پیش ہے۔" وہ شاعروں کی عزت کرتا اور خاص کر ہندی کو شعرا کے ساتھ زیادہ سلوک کرتا۔ اس کے عہد میں ملا جامیؒ کی یوسف زلیخا۔ روضۃ الشہدا۔ اور منوہر و مدمالت کا قصہ جکو عاقل خاں خوافی نے نظم کیا تھا۔ ملا نصرتی اور دوسرے شاعروں نے ان کتابوں کے ترجمے دکنی زبان میں تالیف کیے۔ اور خوب شاہانہ انعام اکرام پائے۔"

ملا نصرتی نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ گلشنِ عشق ترجمہ ہے۔ اور نہ وہ ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ گلشن عشق باعتبار خیالات اور فنِ مثنوی عاقل خاں خوافی المتخلص رازی کی مہر و ماہ سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ ہاں رازی خود مقر ہے کہ انہوں نے مہر ماہ کو ہندی قصے سے لیا ہے۔ غالباً شمالی ہند کی مختلف بولیوں میں یہ قصہ موجود ہوگا۔ اسی کو رازی (دہلوی) نے فارسی میں منظوم کرلیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

زلوحِ ہندوی ایں نسخۂ راز | بہ نقشِ فارسی شد جلوہ پرداز

عاقل خاں نے اس مثنوی میں اپنے پیر شاہ برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف کی ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دلی میں رہ کر اور شاہی متوسلین میں سے ہوکر جصت

اورنگ زیب بادشاہ غازی رحمتہ اللہ علیہ کی مدح اڑا گئے ہیں :۔

اس مثنوی کے دو قلمی نسخے کتب خانۂ آصفیہ میں ہیں۔ ایک شمارہ ۹۹ لغت قصص کے تحت میں " قصۂ مہر و ماہ منظوم کے نام سے طبعی خط میں اور دوسرا شمارہ ۱۶۴ مثنویات کے ذیل منحصر داستانِ منوہر و مدھ مالتی کے نام سے شکستہ خط میں محررہ ۱۲۱۸ھ ۔ در حیدرآباد از دست پرتاب رام بندۂ درگاہ حضرت شاہ عالم عالی گوہر۔

ایک اور مثنوی مدھ مالت کے نام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار کی حسام الدین غازی نے بمقام حصار فیروزہ ۱۱۷۰ھ میں لکھی ہے ۔ چنانچہ خود اس کی تاریخ کہتے ہیں۔

ز تاریخ عرب کردم شمارے بہفتاد و یک افزودم ہزارے

اس مثنوی کا موضوع بھی منوہر و مدھ مالتی کا عشقیہ قصہ ہے یہ مثنوی بہت کمیاب و نادر ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۱۹۸ھ کا لکھا میرے کتبخانہ میں موجود ہے ۔ اس میں حضرت عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ بادشاہ غازی کی شانِ مبارک میں ایک طویل قصیدہ بھی ہے ۔ جس میں حضرت کے والد اور بھائیوں کے ساتھ سلوک کو طرفدارانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے ۔ گلشنِ عشق سے یہ مثنوی تین سال بعد کی تصنیف ہے ۔ اور مہر و ماہ تین سال پہلے کی۔

میرے زیرِ مطالعہ اس وقت پانچ نسخے گلشنِ عشق کے ہیں۔ دو ہز اکسلینسی نواب سالار جنگ بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ جس پر ٹیپو کی مہر ہے ۱۱۰۸ھ میں محمد شریف نے لکھا ہے ۔ اور دوسرا نسخہ ۱۱۳۹ھ کی تحریر ہے۔ اس نسخہ میں اشعار کی جملہ تعداد (۴۶۰۲) ہے ایک تیسرا نسخہ اور صاحب موصوف کے کتبخانہ میں ہے ۔ جو باتصویر ہے ۔

دو نسخے میرے کتبخانہ میں ہیں ۔ ایک نسخہ میں تینتالیس ۴۳ عنوانات ہیں۔ جن کے اشعار ۴۴ الس ہیں۔ جو قصیدے کی بحر میں ہیں۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد چار ہزار

پانسو باون ہے۔ جن کی جملہ تعداد چار ہزار پانسو چورانوے ہوئی۔ پندرہ سطری تین سو آٹھ صفحہ ہیں۔ اکثر صفحوں میں کمی بیشی واقع ہوئی ہے۔ میرا دوسرا نسخہ شیخ اللہ داد متبنیٰ شیخ ایوب فارسی نویس قصبہ ہتنورہ کے ہاتھ کا ۱۱۵۱ھ کا لکھا ہے۔ پندرہ سطری تین سو نو صفحہ ہیں۔ اکثر صفحوں میں سطریں بڑھتی گھٹتی ہوگئی ہیں شیخ اللہ داد نے خاتمہ کی تحریر منظوم لکھی ہے۔ اس سے اس نسخہ کی جملہ تعداد ابیات اور سن کتابت معلوم ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جگت شاعراں کا تہیں بگ یا کہ لک آفریں ہے تجھے نصرتی

تو ابیات کل مجمعہ چار ہزار
دگر چار صد ہور اسی یک شمار

لکھنہاریوں ذوق پاتا تھا
بھی پڑنے کیرا شوق آتا اتھا

شب و روز تحریر بھی کام میں
تو ایاں غنیماں کی دھوم دھام میں

میں لکھنے لگیا تھا اسی ہیاں میں
شروع تب کیا ماہِ رمضان میں

بھی او ماہ ذالحجہ ظاہر ہوا
کہ پنجم وو تاریخ آخر ہوا۔

کہ توفیق پا از غفور الرحیم
دو شنبہ قمر نیک تھا مستقیم

سنہ یازدہ صد یک اوپر پچاس
جگوں یافت مطلب تو ہوئے اداس

وہ ہجرت نبی کا اتھے برقرار
یہ سب آفرینش کیا کردگار

کہ سب قصے میں ورسے قصہ یہی
جبیلو لی شعر کے فن منے ہے سہی

پڑیگاں کوں قصہ یو سب آئے کام
ہوا ایک ساعت میں آخر تمام

اس کے پڑہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت یہ نسخہ نقل ہورہا تھا اس وقت قصبۂ ہتنورہ پر غنیموں نے چڑہائی کر رکھی تھی۔ اور شیخ اللہ داد گلشنِ عشق نقل کر رہے تھے۔

کیا لوگ تھے۔ کسطرح کے شغلوں میں اپنا وقت کاٹا کرتے تھے۔ ایک نسخہ۔

دیوان سودا کا حبیب گنج کے کتبخانہ میں ہے۔ یہ اسوقت لکھا جارہا تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی نے دلی پیاری کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ سیطرح جہل حدیث اسوقت لکھی گئی۔ جبکہ دمشق کا محاصرہ ہو رہا تھا۔ اور اہالیان شہر کے لئے زمیں سخت اور آسمان دور تھا ان چیزوں سے مسلمانوں کے علمی شغف و انہماک کا پتہ چلتا ہے۔

قاضی محمود نے جو غالباً نصرتی کے معاصر ہیں ان کی تعریف میں چند اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

ترا شعر ہے نصرتی بے بدل	کہ سب شاعراں میں توں ہے تاج فضل
ازل سوں خدا نے عنایت تجھے	دیا ہے سخن کا ولایت تجھے
اوسی تے ہوا ہے گہر سنج توں	جو پایا ہے غیب کے گنج کوں
شعر بولنا تجھ سیتی حد ہوا	کہ جیسا سکندر کیرا سد ہوا
کہ لکھ آفرین ہے یو تجھ ذات پر	کروڑاں شرف ہے تیری بات پر
ہے اس دور کا شر حیا نی سچا	ہر ایک بول تیرا ہے کانی سچا
ترا شعر ہے آفتاب جہاں	ہر ایک بیت تیری سو ہے درفشاں
توں عارف سچا ہے ہر ایک بات میں	جیوں امرت کا چشمہ ہے ظلمات میں
سکندر کہا جات اس دور کا	کہ باندھا ہے سد شعر اس طور کا
ہندوستان کے لوگ عالم فضل	تیرے شعر پر داد دیتے سکل
سُنے دل سوں تحسیں کئے آفریں	سخن دکہ تجھ سا ہیں ہے یقیں
اگرچہ دکھن شاعراں کا ہے کھن	ولے نصرتی بے بہا ہے رتن
غرض شعر کہنے کا حق تھا تیرا	لگا دو بچن کا ہے مطلق تیرا
ملک شعر کا حق نے روز ازل	کہ بخشا ہے اپنا کرم کر فضل

عبدالرزاق منشی نے ایک رباعی گلشن عشق کی تعریف میں کہی ہے یہ بھی
نصرتی کے معاصر معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

جبی گل نزاکت کا بولا اس چمن میں — بلبل نمن تا پہ لہے اس دہن میں
جو طبع معطر دسے رنگیں نصرت — جن سیر کرے عشق کے اس گلشن میں

نسخۂ ادارہ کے نسخے میں تقریباً چار ہزار [illegible] ابیات ہیں۔ لیکن انہوں نے
تعداد چار ہزار دیا۔ [illegible] ہے۔ [illegible] نسخہ [illegible]
صاحب نے اپنی مہربانی سے [illegible] دیا ہے۔ یہ نسخہ مولوی محب اللہ [illegible] متخلص
بہ عالی خلف نواب مظفر جنگ بہادر [illegible]
کی مجموعی تعداد [illegible]
انشاء اللہ اصل مثنوی معہ شرح و معانی [illegible] نظر ہوگی۔

یہ نسخہ باتصویر تھا۔ جس کی تصویریں [illegible] میاں نصرتی کے
متعلق بہت کم تذکروں میں مسطور ہے۔

گلشن عشق۔ نکات الشعرا۔ تذکرہ میر حسن۔ چمنستان شعرا۔ مجمع الانتخاب
یہ سب تذکرے میاں نصرتی کے حال سے خالی ہیں۔

گارسیں دی تاسی نے انکی تصانیف کے متعلق [illegible] اس میں قصۂ
منوہر کنور و مدمالتی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نام کا ایک علیحدہ قصہ کتبخانہ اعلیحضرت
میں ہے۔ اگر اسکی مراد کتبخانہ آصفیہ سے ہے تو اس میں یہ نسخہ ناپید ہے۔ اگر کتبخانہ
مبارک سے مراد ہے جو شاہی حویلی میں ہے تو اسکا کیا کہنا وہاں معلوم نہیں کیا کیا
نادر علمی جواہر پارے ہوں گے۔ ان تک رسائی تو نصیب وروں ہی کے حصے
میں آئی ہے۔

ایک قدیم بیاض میں میاں نصرتی کی یہ رباعی نظر پڑی جو ہدیہ

ناظرین ہے:۔

پونچیکا تجے اوا دپہ کچھ قسمت ہے	اس مغانہ فلک کی تجھے کیا منت ہے
فی نہیب یونی یہ فلک کے پردا	چرخی یہ کہ یک راند کو یو ہمت ہے

ایک کتب فروش جو پرانی کتابیں فروخت کرتے ہیں ان کے پاس کی ایک بیاض میں افضل کی ایک غزل تحریر تھی۔ میں نے اس کی نقل لینی چاہی انہوں نے انکار کیا۔ اور اس بیاض کی قیمت صرف افضل کی غزل اور میری خواہش کی وجہ سے سو روپیہ بتائی۔ مجھے مجبور ہو کر لینی پڑی۔ اس لئے یہ سو روپیہ کی غزل سے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

نین بن لاگی ہے کاری منجے	لگے جیت پی رات ساری منجے
نیت سب بجز راجہ جا کموں شک	لگے جیو تلک کر دکاری منجے
ہمبولیہ ہوں جو میں کفر اسلام کوں	نہی بس جو لاگی ہے یاری منجے
تیرا فضل ہوئے گا گرا ئے کی	توہی ہے تو امید واری منجے

پیاری دک پیار ہو لطف سوں
تو افضل کر پکاری منجے

گلشن عشق کا موضوع یہ ہے کہ ایک شہر کنک گیہہ ہے وہاں کے راجہ بکرم کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ راجہ بہت سخی اور رعیت پرور ہے۔ ایک روز راجہ کی رانی کچھ پکا کر راجہ کے لئے لائی۔ راجہ کھانے بیٹھا تھا کہ ایک فقیر کی صدا سنی۔ فوراً کھانے کا تھال لے کر اسے دینے گیا۔ لیکن فقیر نے بہت جھڑک کر کھانا لینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کہ بانجھ کے گھر کا کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ راجہ یہ سنکر بہت شکستہ دل ہوا۔ فقیر چلا گیا۔ اور راجہ واپس آگیا۔ رانی نے جب یہ ماجرا سنا تو کہا کہ تو فوراً جا فقیر کو ڈھونڈو۔ ضرور وہ کوئی صاحب کمال ہے۔ رانی نے راجہ سے کہا کہ میں ایک

گھنٹہ لٹکائے دیتی ہوں۔ تو جب بامراد واپس ہو تو اس گھنٹہ پر تیر مارو میں سمجھونگی کہ تو آگیا۔ اور محل کا دروازہ کھول دونگی۔

غرض جب یہ طے ہوگیا تو راجہ وہاں سے سدھارا۔ اور رانی نے یہ ترکیب کی کہ سب کی آمدورفت بند کردی۔ اور مشہور کردیا کہ راجہ بیمار ہے۔ راج پاٹ کا کام خود چلانے لگی۔ راجہ ایک جنگل میں پہونچا۔ وہاں ایک باغ تھا اس میں گیا تو کیا دیکھتا ہے ایک بہت خوبصورت حوض ہے۔ پریاں آئیں اور وہاں لگیں نہانے۔ اس نے چپکے سے اٹھ کر آنکھ بچا ان سب کے کپڑے چرا رکھ لئے۔ جب وہ نہا دھو فارغ ہوئیں اور لباس کو نہ پایا تو بڑی حیران ہوئیں

آخر راجہ نے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ پریوں سے یہ شرط قرار پائی کہ وہ راجہ کو درویش کامل تک پہنچا دیں پریاں راضی ہوگئیں۔ اس نے پوشاکیں حوالے کیں۔ وہ پہنکر اُسے اڑا ایک کامل فقیر پاس لے گئیں۔ اور ہر ایک نے بوقت رخصت اپنی لٹوں کے بال حوالہ کئے کہ بر وقتِ ضرورت انہیں جلائیں۔ فوراً حاضر ہونگی۔ اس نے فقیر کی بہت خدمت کی۔ فقیر خوش ہوا اور کہا کہ باغ میں جاؤ درخت سے پھل طلب کر جو ملے اسے لیجا اور رانی کو کھلا۔ اولاد ہوگی۔

راجہ نے اسپر عمل کیا۔ اور پھل لیکر لٹ جلائی۔ پریاں حاضر ہوئیں۔ اور اسے لیکر اڑیں اور اس کے شہر میں پہنچا گئیں۔ اس نے گھنٹہ پہ تیر مارا۔ رانی نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں ملے بہت خوش ہوئے۔ رانی نے حمام کرایا۔ لباس بدلوایا۔ راجہ نے پھل رانی کو کھلایا۔

آخر رانی کے ہاں لڑکا ہوا۔ منوہر کنور نام رکھا گیا۔ نجومیوں نے ستارے دیکھے۔ اور کہا کہ ایک مرض ایسا ہوگا جو لاعلاج ہوگا۔ اور اس سے اُسے سخت اذیت پہنچیگی راجہ بہت پریشان ہوا۔ آخر حکیموں نے کہا کہ وہ عشق کا مرض ہوگا۔ جس کی کوئی دوا

ہیں۔ راجہ نے اسکا یہ انتظام کیا۔ کہ ایک بھونرا بنوا کر اس میں مہر کنور کی پرورش کرانے لگا۔

ایک رات سات پریاں سیر کو نکلیں۔ اس نئے محل کو دیکھ کر نیچے اتریں اور اندر داخل ہوئیں۔ مہر کنور سو رہا تھا۔ سب نے کہا کہ یہ بے مثل ولاثانی ہے۔ دنیا میں اسکا جوڑ نہیں۔ لیکن چھوٹی پری نے کہا کہ خدا نے ہر چیز کا جوڑ اتارا ہے۔ اسکا بھی ضرور ہوگا۔ اس پر بحث مباحثہ ہوا۔

غرض پریاں ڈھونڈنے اڑیاں سب تھک کر ناکام واپس ہوئیں۔ لیکن چھوٹی پری پتہ لگا کر آئی۔ اسنے جو ذکر کیا سب مشتاق ہو۔ مہر کنور کے حسن سے مقابلہ کرنے اسکا پلنگ لیکر اڑیں۔ اور شہزادی کے محل میں لیجا کر رکھ دیا۔ خود تکان اتارنے قریب کے جنگل میں چلی گئیں۔

مہر کنور ہوشیار ہوا تو نئی جگہ دیکھ اور ایک نوعمر شاہزادی کے پلنگ کو دیکھکر حیران ہوا۔ جب اسکی آنکھ کھلی۔ اور اسنے مہر کنور کو دیکھا وہ بھی بہت حیران ہوئی اس سے کہا کہ ہمارے نگر اس شہر کا نام ہے۔ اور یہاں کے راجہ کا نام دھرم راج ہے میرا نام مدھمالتی ہے۔ اور میں دھرم راج کی بیٹی ہوں۔ ان دونوں کی گفتگو بڑی مزیدار ہوتی ہے۔

نصرتی چونکہ دربار دار ہے۔ شاہی آنکھیں دیکھیں ہیں مدمالتی اور مہر کنور کی تقریریں انکے شاہی رتبے سے کوئی بات گرنے نہیں دی ہے۔ اور ان کا آپس کا برتاؤ ان کے شاہی خون پر دال ہے۔

ان کے سراپے کا بیان۔ اور مکان کی آرایش کا حال جو بتایا ہے پڑھ کر انسان عش عش کرجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں دیکھی باتیں لکھی ہیں یہ شاہی طمطراق دیکھ چکا ہے۔ اس لئے جو بات لکھتا ہے آنکھوں دیکھی ہوتی ہے۔

خیالی تکرلیس نہیں ہوتی۔ غرض دونوں میں باتیں ہوتی ہیں مہر کنور اپنا چھلّا اسے پہناتا ہے۔ وہ پہناتا۔ اور انگوٹھی اسے پہناتی ہے۔ مہر کنور اسکے پلنگ پر جا بیٹھتا ہے وہ اسکے پلنگ پر آکر لیٹ جاتی ہے۔ دونوں سو جاتے ہیں۔ نیند کا بیان اس طرح کیاہے کہ دماغ میں خنکی ہو جائے۔ سوت کی نیند ہو تو بھاگ جائے ملاحظہ ہو:۔

دندی خواب تے کوئی نہ بذرا ے	دے دوست پن وند پرور اے
لے بازی گری خواب آتا ہے جب	چھل نین میں لیا دیکھا تا ہے بس
عجائب جو خوش گت ونیھا تر ن	بن افسوس حاصل نہوئے کرتی
اگا خوب غفلت کے آرام میں	ستی ہوش کے مرغ کوں دام میں
زبردست اچھے گر یہ ستم کے	سوتے پر چلے بندلے یک یوزاد
تا دالے دشمن وحدت سب	دے سوت بن بھاسکے ناشبا
جو تجار کا خواب سنگ میلا	نپ س مال سوں خوب کا کھیں ہوئے
جکوئی دین و دنیا کے تخت زرد	وہ مر دی سوں ہر رین بیدار ہیں
میسر جسے شام وسلت اتے	بڑی حسرت اس خواب غفلت اچھے

پریاں آتی ہیں اور مہر کنور کو اڑا کر کنک گیر لے جاتی ہیں۔ اب جو صبح منہر کنور کی آنکھ کھلتی ہے۔ تو دیوانوں کی سی نوبت ہو جاتی ہے۔ بادشاہ اور ستے بہت پریشان ہوتے ہیں۔

آخر منہر کنور کی دوا بڑی ترکیبوں سے اس کا مدعا پاتی ہے۔ بادشاہ سے عرض کرتی ہے۔ بادشاہ مہارس نگر کو ڈھونڈنے اپنے بڑے ہوشیار جاسوس روانہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس زمانہ کے جغرافی معلومات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اور بہت سی ملکوں کے نام جو اس زمانہ کے لوگوں کو معلوم تھے۔ ہمارے علم میں آتے ہیں۔

چلیاں جل پہ کشتیاں ڈھال اس حال میں | ڈھلاتے ہیں پارے کو جیوں تھال میں
کہیں بحر کوں خلق بالا بدل | ہور اس تیز کشتیاں کوں چلیاں نچل
سبک یو کی کشتی فلک بحر پر | چلے کیا کہ اس تے بی یو جلد تر ے
چلاوے اگر کوئی کماں کس کے تیر | پڑے اس پہ کشتی قرباں ہو بھیر
بھکیلی اگر کوئی ترنگ بے قیاس | اچھے پیٹ سوں اسکے جم دم کے پاس
منگے باؤ گر نہانے دست ما۔ | پچھاڑے اسے ہم سوں لیا پگ تلا
اٹھے موج گر نہانے کف بکف | کنارے پڑے لیا اپس مکہ میں کف
بندے باو جب یک یکس سوں بھریاں | بلند موج ہوں جز او تر کیاں یاں
چڑنت میں تو چڑتے چلیں ماہ لک | اترنے میں اتریں تو ماہی تلک
اونن کے انگے کیا عراقی ترنگ | چلیں چڑ اوتریوں اوپر سب او لنگ
ثریا لک یک پل میں معراج ہوئے | ثری لک گھڑی یک میں اعراج ہوئے
منگے موج پڑنے جو کشتی بھیتر | کرے تل او سے جائے کشتی اوپر
جتا کچھ جو کشتی کوں جھولا لگے ۔ | دو جھولا بڈا اں کو ہندولا لگے۔
[illegible] دے سو دیکھیں تو چو پہر جب | اوپر آسماں ہور تلیں نیر سب
صفائی او دریا کی خوش آب کی ۔ | اچھیں وھن کے رخسار پر تلب کی
[illegible] یہ خوش اس جلپہ گرداب یوں | اچھیں زلف دھن رخ پہ پرتاب جیوں
دے آب پر یوں سو کھب کھب کے بھار | ڈھلیں دھن کے جوں کیس شانے تلہار
بٹیاں سار کے جل میں معقول سی | جزیرے نہیں جیب کے س پھول سے
بندے ہیں [illegible] یہ حسن بات کے | دسیں بحر میں سب وتے ذات کے
کتیاں ماہیاں صورت انساں کیاں | کتیاں اسپ ہور بیل کے جنس کیاں
کتیاں کہ دہور میش و اشتر من | کتیاں گرگ سیاں ہور کتیاں گرہ تن

کتیاں میش سیاں ہو رکتیاں موش سیاں | کتیاں بہن تر فیل کے گوش سیاں
کتیاں شیر سیاں خرس سیاں کئی درشت | کتیاں کھول مانجر کتیاں خارہ پشت
کتیاں گرگ سیاں ہو رکتیاں شل گور | کتیاں جوں گوزن و کتیاں اندہور
کتیاں زاغ سیاں ہو رکتیاں جوں زغن | شتر مرغ کوئی ۔ کوئی سو عنقا من
پرند یاں کتیاں عین عصفور سیاں | اڑیں پر اتر تیاں سو جادو سیاں
کتیاں ات بزرگی میں ڈونگر مثال | کتیاں خورد تر جو کہ باریک بال
کتیاں کی سو صورت ڈراؤ لگے | کتیاں کی شبیہات سہانی لگے
کہیں دیکھ پھر خوش نظارہ کریں | کہیں دھاک سوں دل آوارہ کریں
کسی ٹھار پر جیو میں ہوئے عیش پور | کسی ٹھار دل غم سوں ہوئے چور چور

منہر کنور کا جہاز تباہ ہوتا ہے ۔ یہ آخر تختے سے لپٹ کر خشکی پر پہنچتا ہے ۔
یہاں جاڑے کا وہ سماں باندھا ہے کہ پڑھنے سے تھر تھری چھوٹتی ہے ۔ دانت سے دانت بجنے لگتا ہے ۔ تحریر میں برف کٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ نصرتی دکن کا باشندہ کسطرح جاڑے کا حال ایسی باریکی سے بیان کر سکتا ہے کہ تبت اور لداخ والے بھی اسکے مقابلہ میں جو بولنے آئیں تو زبانیں منہ میں اولا ہو جائیں ۔ پھر صنایع لفظی ومعنوی وہ وہ دکھائی ہیں کہ سبحان اللہ وصلی علی ۔ سردی سے جو بادل بنکر بارش ہوتی ہے اسکا حال بھی بیان کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی دریافت نہیں بلکہ دکن کے لوگ بارش کے اس سبب سے واقف تھے ۔ اور وہ وہ متضاد کیفیتیں لفظی تراکیب سے پیدا کی ہیں جو نصرتی کی نزاکت خیال ونفاست طبع پر دال ہیں ۔

یو جوں آگ کی بازی پڑی دیکھ کم | اوچائی کھنڈ اپنا جگت میں علم
پکڑ بر دفن مردتا ورد کا ❊ ❊ | کھڑک تیز دوڑی ۰ اسے ردکا
اگن تس انگے دب کے ہوی کمزبان | لگی کانپنے ات اوچایا نشان

بسے ہم کی تیزی نپٹ دسے نیاز ۔۔۔ کری لاف تے کم زبان دراز

پکڑ ڈر نچیت ان نہ کھانے لگی ۔۔۔ سو ہو زود رو مکھ چھپانے لگی۔

اگن تے مگر ٹھنڈ کا سخت ڈر ۔۔۔ لجایا اتھا جسم ہو جیو منقبض کر

جو پاتی تھی ا۔ لکھ مسیحا تے دم ۔۔۔ او جاتی نہ تھی زندگی کا علم

اوک ٹھنڈ کا سو جہانگیر داب ۔۔۔ لیا تھا ہر اک شے تے گرمی کا تاب

رکھی دیس کوں دھر کے لکا دبا ۔۔۔ کرے شب کوں شبنم کے ان سوں شبا

سو بونداں تے جب وس کی مار ہوئیں ۔۔۔ کلیجے تے گولیاں من پار ہوئیں۔

(بجائے تیر کے یہاں گولیوں کی مار میاں نصرتی کی جدتِ طرازی ہے۔)

ہوا پیٹتے پڑتے اگن سرد جھڑ ۔۔۔ رہے چپ ہٹا اس تے ہر تن اکڑ

ہوا میں سے سرد آگ جھڑ پڑتی تھی اس سے ہر ایک کا جسم جم مر ہو اکڑ کر رہ جاتا تھا۔ اس میں متضاد کیفیات داد طلب ہیں۔ سرد آگ اور جھلسی ہوئی اکڑ عجیب ہے۔

ہوا سرد کا تیر ہوئے دھڑتے صاف ۔۔۔ اچھنبا اگر تن پہ جیں خط لحاف

ملائک مگر حقہ زمہریر ۔۔۔ جو کھولے اتھے سال گذرے پہ پھیر

اچھے سو جکوئی تیر قد سے جوان ۔۔۔ کریں اپنے تن پیر نمنے کمان

گہ خوش لگی۔ کرے سن کوں توس ۔۔۔ لیا تھا ہوس سوں تو ہر منکوں توس

اچھے گرچہ سنگ آگ کا بے تمیز ۔۔۔ پن اس وقت تے سبکوں جیو تے عزیز

وطن چھوڑ جاتی نکل اگ ولے ۔۔۔ جتن جیو تے کر جب رکھیا بند گلے

اگن بن سد نگ۔ سیج سکین ہو کمان ۔۔۔ ہوئے ہیں سو او تیرے قد کمان

مگر جوش کھات جو سے زمہریر ۔۔۔ کیا تھا رواں سرد آتش کا نیر

"سرد آتش کا نیر" کیسی انوکھی ترکیب ہے۔ آگ پانی ٹھنڈ گرمی کو کیا سمویا ہے۔

ایک ایک شعر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے ۔ جسقدر غور کریں اتنا ہی لطف زیادہ آئے ۔ سبحان اللہ خدا مغفرت کرے ۔ کیا تھے میاں نصرتی ۔ اور کیا تھی وہ خاک جس سے یہ اٹھے اور پھر ملگئے ۔

ہوہوی تس تے افسردگی تابناک	ہوا جم کے پالودہ یک آب پاک
دیا دوغ سا برف پڑتے وہیں ۔	ہوا نیر کے شیر کا جم دہیں
پن اس دہی میں ہر یک تا شانول	کرے دھوپ انگے کھیو کے نمنے پگل
نکہ برف بھیں پر ہواتے جھڑے	مگر کھم کی چربی ٹھنڈوں گل پڑی
دیا خوش گگن کے لگن تے نچل	چھڑی شمع سوں تس کو روغن پگل
سے یوں زمیں پر ہوا برف رچے	کئے ہیں مگر فرش بلور کچ ۔
بہی تے دسیں ڈونگراں تے گھنے	نچل صاف سر ہو کے مانند پیرا
نہ ڈونگر ڈھکارے دسیں شور کے	ہٹیں دو وجھی ساں سو بلور کے
پینی جو سخ جوب پہ خوب دہات	دسے جوب سوں عین مصری نبات
کنکر سخ سوں شکر بھیوٹا نے دیں	نہی ریگ سوں سونپ دانے دسیں
نہ صورت میں پڑنے تے سخ کم اتھا	جو سیرت میں تس گرد پر کم اتھا
سہاتے تھے ہو صاف رن بن کھلت	خجل تھا صفائی سوں اس دہو گیا
اوک دیکھے سردی کا آزار ہو	نہالاں اتھے ٹھنڈ سوں بیمار ہو
اتھا نزع میں جیو ہر بات کا	کلیاں میں نہ تھا خندہ خوش وقت کا
نکتی تھی ہو کونپلی سر فراز	نہ تک ہو سکے بیل کا ہت دراز
چھپیاں سوں کلیاں اڑہ لیوں لحاف	ہوا تھا سو اس پر بھی یخ کا غلاف
بندی تھی ہوا راہ پر یخ کا سد	اسے واٹ جانے نہ تھا کس بھی حد
اوڑے تو پنکھی تس کدن پر جھنگ	پڑے برف سوں پہ ہو کو لا املک

اوگاراں کی آتش ہے تس تن منہار | کیاں تھیاں منہ تھنڈ جل ختیار
وہی سر داگن ہو سمند میں اثر | چلی جل جلی سو دہواں چرخ پر

اوپر کے شعر میں بارش وابر کس طرح بنتا ہے اسکو دکھایا ہے۔ وہی سرد آگ ہو سمندر میں اثر کرے تو پانی جلنی سے دہواں ہو کر آسمان پر چلے۔ پہلے مصرع کو ترکیب کی وجہ سے منی کر کے چھوڑ دیا۔ مطلب نہیں سمجھایا۔ کیونکہ ترکیب کا لطف جاتا رہتا۔

اسکے بعد منہر کنور ایک بن میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں کا اندھیرا اسطرح باندھا ہے کہ آنکھوں تلے اندھیرا آجاتا ہے۔ پھر ایک جگہ روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اس نور و ظلمات کے تلازمے سے جو جو پیاری ترکیبیں اور تشبیہیں پیدا کی ہیں وہ بالکل انوکھی و عجیب ہیں۔

چلیا اس اندہیارے میں تہو مان جب | دسیا اک اوجالے کا واں چشمہ تب
کہ جیوں دایرہ گرد تھا گرد بن | دو ذرہ اوجالا سو مرکز منن
دیا نیلگوں چرخ میں نامدار | دسے جوں سورج استوا کے منہار
لگی کئی ظلم میں صفائی او تنک | اچھے گرد حجرے کوں جوں دود ھنک

مندرجۂ ذیل شعر میں "جل بسندی"۔ پانی کے بسنے والے بڑی پیاری ترکیب ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ لیکن زردشتی نژاد وں کو اس میں سے کسانڈ آئیگی۔

جنم رہیں اس گرد جنگل منے | کہ جیوں جل بندے بسیں جل منے

اکثر جگہ ملکی تلمیحات بڑی پیاری طرح برت گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

اوتر بھوئیں میں یوں ہی ہے سر حبٹ لبنی | کہ جیوں نا ندرک کی اچھے پاربتی

اس شعر میں نا ندرک کی پاربتی، استعمال ہوئی ہے جو غالباً ان کے زمانے میں مشہور ہوگی۔ نا ندرک میں کوئی شیوجی کا مندر ہوگا۔ اور وہاں کی پاربتی جی کی مورتی

دکن میں مشہور ہو گی۔

اوچا ترت گوداوری میں بھی من   درو ماولی کا نہ ہوا برہمن

سمجھ ناں نس چشمہ سندان کا   رکھیا وانچہ لک حد ایس دصیاں کا

انکی ناں کو سندکا چشمہ سمجھ کر اپنے تخیل کو وہیں تک محدود رکھا۔

یہ قومی شاعری کہ سندھ گنگا جی اور گوداوری کو چھوڑ کر سیحوں جیجوں میں جا کے نہ ڈولے۔ گنگا جی کو وجدی نے اپنی مثنوی تحفہ عاشقاں قصہ گلرخ وہرمز میں باندھا ہے۔

عیاں تجہ نظر میں جہین بھاس ہے   تیرے فہم کی سرستی داس ہے

یہاں علم کی دیوی سرسوتی کو کھپایا ہے۔

بلبل وقمری کی بجائے ملکی پرند پپیہا اور کوکلا استعمال رائے ہیں ملاحظہ ہو

ہو مطرب پون برگ کا دف بجانے   پپیہا و کوکل نول تان اچانے

مقامی درباری اصطلاحات بھی برت گئے ہیں۔ خیلخانہ بیجاپوری بادشاہوں کی درباری اصطلاح ہے۔ خدام و متوسلین شاہ کو خیلخانہ کہتے تھے اس لفظ نے بیجاپور ہی میں جنم لیا ہے۔

انو بی خبر خوش یو پانے سنے   ادک عیش کر خیلخانے سنے۔

اکثر جگہ بے ساختہ طور پر ضرب الامثال استعمال کر گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لکھے ہیں کو ادت کہن کی پٹی   کہ کوئی نہ کہے چھاچ اپنی کھٹی

نہ رکھنا ہو جب عیب جن بول س   کہ کہتے ہیں عاقل کوں یک نکتہ بس

کہ جیوں مار موں میں بچہ کر موں   نگل سک نہ سٹ سک رہیا ہو خموش

"ک" جو علامت اسم فاعل کی ہے۔ اور قدیم ہندی میں استعمال ہوتی ہے

اسکی ترکیب سے ایک لفظ" لاوک "بمعنی لانیوالا برت گئے ہیں ۔ اس قبیل کے اکثر الفاظ ہندوؤں کی زبان پہ آجاتے ہیں ۔ اور کہیں کہیں اردو کی کتابوں میں بھی، آگئے ہیں :۔ مثلاً سیوک ۔ پاٹھک ۔ پتھک ۔ آدک ۔ جاوک وغیرہ ۔ ملاحظہ ہو

اچھے عقل لاوک ۔ نت اخلاص کی ستو عقل ہوئی دلبر خاص کی ۔

بعض جگہ عربی الاصل صفات میں تذکیر و تانیث کی وجہ سے ردّو بدل کیا ہے ۔ مثلاً ۔ نو رانی کی بجائے "نورانا" صفتِ مذکر ۔ تن کے سبب استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو ۔

نورانا تن اسکا جو تھا عین ماہ ہوا تھا دو دیجور شب تے سیاہ

پھلاں کو آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے حضرت شاہ عالم کی ایجاد بتایا ہے ۔ حالانکہ میاں نصرتی اس لفظ کو اپنی مثنوی گلشنِ عشق میں برت گئے ہیں

ہر یک ٹھار کر سو شگانی آتال + چلیا ہوں سو گند تاج یوں پھول مال

"تا ہے" علامت زمانۂ حال قدیم دکن ہے ۔ آب حیات میں شاید لکھنؤ والوں کے سر اسکی ایجاد کا سہرا باندھا ہے ۔ کیونکہ اساتذہ کے ہاں ۔ اردو میں "ہوئے ہے ۔" "آئے ہے" جائے ہے" ۔ بجائے" ہوتا ہے" "آتا ہے جاتا ہے" کے استعمال ہوتا تھا ۔ میر تقی میر کے ہاں اسیطرح استعمال ہوا ہے ۔ آگرہ والے ابتک بے تکلف بول چال میں اسی طور پر بولتے ہیں ۔ جیسے" اے ٹھیرو وہ آئے ہے نا" لیکن دکن میں "تا ہے" علامت حال قدیم سے مروج ہے ۔ جیسے

سچیں جب بھجنگ پاس اچھتا ہے من اوجالا ہے تس جگ میں کالی رین

اس اندھیرے جنگل میں منوہر کنور ایک درویش سے ملتا ہے ۔ پھر چلتا ہے ۔ رستے کی گرمی کا حال دکھایا ہے ۔ پڑھنے سے ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ جاتی ۔ اور حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں ۔ دم گھٹنے لگتا ہے ۔ اور پڑھنے والا پسینہ میں شور بشور ہوجاتا

سبحان اللہ کیا وسیع نظر تھی ۔ اور کیسے زبردست معلومات ۔ بھلا کہاں دکن اور کہاں گرمی ۔ کیا ریگستان کا باشندہ بیان کریگا جو میاں نصرتی کہ گئے ہیں ۔ اللہ اکبر کونسی خاک تھی جس سے ایسے صاحب کمال اٹھے اور اسی میں مل گئے ۔ دھن بھاگ بیجاپور کہ تجھ سے ایسے ایسے اٹھے ۔ بیشک اگر تجھکو دکن کی دلی کہا جائے تو زیب دیتا ہے ملاحظہ ہو ۔

صفت اس دھوپ کالے کی عاشق بن تپیا یاں پڑیا تھا شور دریا میں او بلتا گرم پانی

رم ہو پانی ۔

جوانی سوں تھی دھوپ بھر روت میں	سورج تھا مگر آخری حوت میں
نکہ سور بل اگ کا بادل اٹھا	نہ او دھوپ یک آتشیں جل اٹھا
گر کھینچ دریا کے دوزخ تے میر	برستا اچھے جگ پہ جلتا چہ تھیر
کرن میں سو او جل کیاں ہاراں دیس	ہر یک ذرہ قطرات باراں دیس
زمیں تے فلک لگ سب یکدہات سوں	بھرے سرو آتش کے برسات سوں
لگی مارنے جب سراباں کی موج	چلیں جوکدھن تب حرارت کی فوج
بھری یوں حرارت ہر یک تن منجھار	نہ تلے سماسک اوبل آئے بھار
پڑی تھی نکیں چھاؤں ہر تن تے دل	اونکلے سو تلے بھتے ۔ اگل
ولے اس دل میں عجب طرف دھات	جاتا تب پھیر نہ کھینچ اپنے سات
نہ دھرتا تو یو نیر عالم تے فرق	تو ہوتے جہاں سب حرارت میں غرق
نہ بھین یہ تپش دن کو دائم اتھے	قیامت فلک پہ بھی قایم اتھی
دھڑک دھک ادک گگن پر صبح و شام	گگن سنج تانبے منن ہوے تمام
سر فیل کا ہے ۔ ین ہات سور	او جاتے ہیں اجرام ہو رہے سو چور
گگن کے اگن پر نہ تارے دسین	او بھٹے جگت لوگاں سو سارے ہسیں

جو انصاف سوں ہو کہ قاضی قضا ۔ عمل سے وطن وے دیا سو رضا

چلے جائیں سب نیک بد باندہ صف ۔ بدی دھیر کوئی کوئی سو نیکی طرف

ہو آیا اگن گرم مس فی المثال ۔ رپا کارنے بھیں تے چندنے کا گال

نخہ اصل میں کیا یو سیماب ہے ۔ روپا گل کے تس تے ہوا آب ہے

برستی تھی یوں دہوپ جگ پر کڑک ۔ سو کوہ و زمیں رہے تھے چھاتی تڑک

مگر سور کے لوز کتے تئیں گگن ۔ بنایا تھا اصل نوری نسن

نکل تس تے جا سب ہریالی کے بال ۔ اتھا بھوئیں کے سر جائیں چاٹی کا حال

پڑیا تھا نہ دریا میں سو جاں ن شور ۔ اتھا نیر ابلتا ہو بھوئیں گرم زور

کری جگ میں گرمی نے یوں سرکشی ۔ اوگی کونپلے رکھ کے ہو آتشی

نہ ڈونگر سرنگ تر کیا تھا بہار ۔ فلک بلکہ برسیا اتھا لعل انگار

دیکھت کوہ ہولی نرالی ہولی ۔ زمیں دیکھ حیراں دیوالی ہولی

بھرے لعل کھوڑے دس آتے تھے یوں ۔ جو لیاں میں اگن دیک دہکاتی ہے جیوں

دکھا دہوپ ادک جگ پہ گرمی ن تاب ۔ لجا لی اتھی بھوئیں کے سب کہ تے آب

سورج سوس سوں ہر جھڑی تھی مگر ۔ لیا تھا ٹھنڈا نیر سب کھینچ کر

یقیں آفتاب آفت آب تھا ۔ تو ہر چاہ پر آتش ناب تھا

رہیا کیں نہیں روئے گیتی پہ آب ۔ مگر تھی ندیاں سی ہوا پر سراب

چرندے ادک پیاس تے تس پہ تٹ ۔ چھوتیں دوڑ مرتے اتھے سینہ پھٹ

عجب تیز گرمی جلا سنگ و خاک ۔ کرے سنگ کا چونا و ماٹی کو راکھ

اتھے گرم کنکرے انگاریاں تے تیز ۔ دسے تعفت بالو تے چنگیاں کی ریز

پڑے جس ہرے رکھ پہ یو آب نار ۔ جلیں پات ڈالیاں تے چیک آئے بہا

نسے آگے لگتی تھی جھالاں کی آنچ ۔ اتھا سخت جانا اونے جیو تے بانچ

نہ سکتے تھے ہرگز پرندے پھٹک / چرندے بھی تس دنگ ہو رہتے اَنک

پکھیاں نے لو بھیجے پکے جوش سوں / پڑیں جل کہ پر گرا ٹریں ہوش سوں

چرندے بی صحرا میں کرتے کدن / سو یک گوشت ہوتے تھے تخنی کمن

کنور یو تو یک رت کی حالت اچھی / برہ تن دوجی بلات اچھی

یتی کچھ اچھی یو دو اگاں کی آنچ / کہ نکلیا اتھا یخ کی سردی سوں بانچ

تیا سخت تس سو تو مشکل کھڑیا / جو اوّل تے چلتے کوں چلنا پڑیا

قدم باٹ پر جہاں رکھے سو لاگ / لگے آگ تلواں تے چڑہ سر کوں آگ

کلیجہ وہیں ہوئے جل بل کباب / نہ سہ سک کرے جوں رواں چلتے آب

پھر اس آپ سوں سوز ہوئے بتر / کہ تس میں نکلیں چونے کے پتھر

ہر یک پگ تو یو ٹگ میں جیو تن تپے / اوک دات آویں پھدیاں پر چھپلے

برہ کا مگر تن میں ہو تیر دو آب / اَپ چایا اتھا یک یہ گ کے حباب

سراباں کی جب گرم یو باو آئے / سو او گلبدن پل میں مرجھا جائے

دیکھے جس تن تو خرابا خراب / سراباں کے بن تو دسے نقش آب

نکیں آدمی کا دسے کچھ نشاں / چھپے دیو ودد [illegible] تھاؤں تھاں

نہ رک ہے جا میں ہیں سایہ دار / جو ہوئے سکے کا نہ کے دوکھی کوں دھار

نچھے تس کے بن دن کوں سایہ ناؤں / کہ تھی اس کی اس سوں بی بیگانہ چھاؤں

ہر یک دن قیامت کے دن تھے کٹھن / جلیا جائے تن سوں سایا آت دن

نہ گرمی کوں رکھے سکیں تس تن کی تاب / کہ سب تن ابلتی رہوے دن کی حباب

ہوا اور چہ گرمی سوں جل بل کباب / بن آن پانی جانے منکے تن تے تاب

ولے اسمیں ہمت سوں باقی اچھی / پھر اس مست کر تیں ساقی اچھی

پوچھی عقل مجھ دل کوں یک بات نول / کہ دکھ بیگناہ پر دیتا کیا۔ بدل

آمز شہزادہ منہر کنور چنپاوتی سے ملتا ہے جو راجہ سورل والی کنچن نگر کی لڑکی ہے
اور ایک دیو کی قید میں ہے منہر کنور اس لڑکی سے مدمالتی کا حال معلوم کرتا ہے دیو کو
مار کر اُسے چھڑاتا ہے اور اپنے ساتھ لیکر اس کے والدین پاس کنچن نگر میں جاتا ہے۔
وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں جب منہر کنور کا حال
سُن لیتے ہیں تو اور بہت مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ چنپاوتی کے آنیکا حال سُن کر
مدمالتی اپنے والدین کے ساتھ مبارکبادی دینے آتی ہے ایک باغ میں ملاقات ہوتی ہے
اس باغ کے حال میں میاں نصرتی نے اس زمانے کے دیسی پھولوں۔ پھلوں۔ پرندوں
باغ کی تیاریوں۔ عمارتوں وغیرہ اور بڑے آدمیوں کے آپس کے میل جول۔ ادب
آداب۔ رکھ رکھاؤ۔ اور اس زمانہ کے دیگر معاشرتی اُمور پر بخوبی روشنی ڈالی ہے اس
خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو گمان ہوتا ہے کہ جو کچھ ہے اپنی آنکھو
دیکھ رہا ہے۔ جگہ جگہ وہ رنگین سہل سہل عام فہم تشبیہات اور ملکی تلمیحات استعمال کی ہیں کہ
بغیر داد دئے رہا نہیں جاتا جیحوں سیحوں کی جگہ سندہ گوداوری اور رستم کی جگہ بھیم نظر آتے ہیں
حقیقت یہ ہے کہ کمال شاعری دکھایا ہے میں اگر اپنے دعوی کی دلیل میں اشعار منتخب
کرکے پیش کرونگا تو مختصر مطول ہو جائیگا میں نے چونکہ ہر ایک شعر کی شرح کی ہے اسلئے
آگے چلکر پڑھنے سے خود ہی روشن ہو جائیگا۔ نصرتی نے ہر ایک طبقے کی سیرت خصلت کے
اظہار میں اُستادی کا ثبوت دیا ہے۔ بڑی مشکل سے چنپاوتی کی ماں مدمالتی کو ایک طرف
لیجاکر منہر کنور کا حال بیان کرتی ہے حالانکہ مدمالتی اسکے عشق میں مر رہی ہے لیکن اپنے
درونی جذبات کو چھپا کر اور اپنے وقر کو قایم رکھ ایسی صاف بگڑ جاتی ہے کہ چنپاوتی کی ماں
اپنا سا منہ لیکر رہ جاتی ہے یہاں شاعر نے مدہ مالتی کی اعلیٰ تربیت اور بادشاہ زادی،
اچھی طرح دکھائی ہے کہ وہ جلد کسی سے گھلو مِٹھو نہیں ہوتی بلکہ اپنے تئیں لئے رہتی ہے آخر
بدقت تمام منہر کنور سے ملتی ہے۔ اتفاق سے مدمالتی کی ماں دیکھ لیتی ہے اور اسکا لطیف

جذبۂ حمیت و غیرت متحرک ہو کر جوش میں آتا ہے مغلوب غضب ہو کے مدھ مالتی کو طوطی بنا اڑا دیتی ہے۔ اور بعد میں بہت افسوس کرتی ہے۔ مدھ مالتی طوطی بنکر جنگل جنگل اڑتی پھرتی ہے۔ آخر ایک شہزادے چندر سین نامی کے ہاتھ گرفتار ہوتی ہے وہ جب اسکے حال سے واقف ہوتا ہے تو گھر سے شکار کا بہانہ کر کے اسے لیکر اسکے والدین پاس آتا ہے پھر مدھ مالتی کی ماں سحر کیا اور اسکا باپ راجہ مہارس نگر چندر سین کی بہت عزت کرتے ہیں اور اسکے سمجھانے سے چنپاوتی کے والدین کو خط لکھتے ہیں۔ چندر سین خود خط لیکر پہنچتے ہیں چنپاوتی کے والدین اسکی بہت توقیر کرتے ہیں۔ جب مدھ مالتی طوطی بنکر اڑ جاتی ہے تو منہر کنور دیوانہ ہو کر نکل جاتا ہے۔ اتفاق سے اسوقت کنچن نگر میں آنکلتا ہے راجہ کو جب خبر ہوتی ہے وہ آکر اسکو لیجاتے ہیں اور مدھ مالتی کی خبر دیتے ہیں۔ آخر میں مدھ مالتی منہر کنور کی شادی ہوتی ہے۔ یہاں میاں نصرتی نے شادی کے قدیم رسوم۔ کھانوں کے نام اور لباس وزیور وغیرہ کی خوب تشریح کی ہے جسکے پڑھنے سے قدیم دکنی اسلامی معاشرت و رسم و رواج پر اچھی طرح وقوف حاصل ہوتا ہے اور وہ شاہی اصطلاحات جنہوں نے بیجاپوری درباریوں میں جنم لیا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی رسم و رواج اور قدیم ملکی معاشرت کی تاریخ لکھنی چاہے تو اس کو مثنوی اور میاں ہاشمی کی یوسف زلیخا سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے چندر سین کی شادی چنپاوتی سے ہو جاتی ہے سب ہنسی خوشی رہتے ہیں اور اپنے اپنے ملک کو روانہ ہوتے ہیں۔ اسکے بعد نصرتی نے علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے اپنی مثنوی کی خوبیاں سراہی ہے۔ اور بادشاہ سے داد چاہی ہے سکے نام پہ اسے ختم کیا ہے مثنوی کا آغاز اسطرح سے ہوتا ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثنا صانع کی ہے جن یو کتاب عشق کا بانی	دیا ہے حسن کو خلعت کہ ہر یک حرف عنوانی
رکھیا ہوں گلشن عشق اسم اس رنگین قصہ کا	کرے جس چھب کے پھولاں پر فلک قوس قزح قربانی

ہم شوق سے اس نغمۂ شوق کو کالج میگزین میں درج کرتے ہیں
زبان کی صفائی ، اور جملوں کی چست ترکیب ، اور خیالات کی
ندرت قابلِ داد ہے ۔ جو دلی اور لکھنؤ والوں سے خراجِ تحسین
وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ادیب صاحب
اپنے میگزین کے لئے اس قسم کی نظمیں ہمیشہ لکھتے رہیں گے ۔

نوٹ ۔ حضرات شاد و اثر کی تتبع میں ۔

(۱)

"دلبر شیریں ادا ۔ دل ہے ترا مبتلا"
سن تو ذرا ماجرا
درد مرا لا دوا
ہو مجھے کیونکر شفا
دل مرا مجھ سے چلا
تھام لے بہرِ خدا
دلبر شیریں ادا ۔ دل ہے ترا مبتلا

(۲)

غم میں ترے اے حسین لب پہ ہے جان حزین
چرخ کہن اور زمیں
کچھ نظر آتا نہیں۔
دور مرا ستے ا میں
وقت غم واپسیں
آتا او ل کے تئیں
غم میں ترے اے حسین لب پہ ہے جان حزین

(۳)

بزم فروز جمال شمع حریم خیال
کیسا بچھایا تھا جال۔
ہوگیا صید ملال۔
قلب ہے جنگ و جدال
وقت سے پہلے زوال
شکوہ کروں کیا مجال
بزم فروز جمال شمع حریم خیال

(۴)

شاہد گلگوں عذار طرہ کش نے بہار
آنکھیں ہوئیں جب سے چار
رہتا ہے دل بے قرار

—

تو جو ملے ایک بار۔

عرض کروں حالِ زار

کرے مرا بیڑا پار۔

شاہدِ گلگوں عذار۔ طرہ کشائے بہار

(۵)

"ہجر میں تیرے پری۔ تلخ ہوئی زندگی"

عقل بھی گم ہو گئی۔

تن کی نہ سُدھ بدھ رہی

جان کی بھی پروا نہ کی۔

رہ گئی کس کی کمی۔

وائے بریں بے کسی

"ہجر میں تیرے پری تلخ ہوئی زندگی"۔

(۶)

"ساقیِ مستی فروش زلف دوتا بدوش"

بندہ ترا خرقہ پوش

جب سے ہوا خود فروش

ہو گئے گم اس کے ہوش

وہ ہے کہ شہرِ خموش

دیکھ تو الفت کا جوش

"ساقیِ مستی فروش زلف دوتا بدوش"

(۷)

"آئی ندا بے خبر : جام فنا نوش کر"

ہوتا تجھے عشق اگر :-

آہ تو رکھتی اثر :-

دل ہے ترا جائے شر

شیوہ اہل نظر

یوں نہیں ہوتا بشر

"آئی ندا بے خبر جام فنا نوش کر"

(۸)

"عشق ہے وجہ حیات عشق کی کل کائنات"

اس کی اگر ہو نہ ذات

عالم کل بے ثبات

عشق ہے وجہ ممات

عشق ہے وجہ نجات

باقیۃ الصّٰلحات

"عشق ہے وجہ حیات عشق کی کل کائنات"

سید احمد علی ادیب بی۔ اے

ابھی الید خداوند وشنو کا نورانی مگر پُر رعب مجسمہ پیکر ضیا باری کر رہا ہے
ایک ہاتھ میں گدا ہے، ایک میں کنول کا پھول، کشادہ سینہ پر مقدس ہیرے
"کوستوب" ستاروں سے مصروف چمک زنی ہے۔

"مادھو" اور "کیتب" کے بے سر جسم اپنے خون میں غلطاں سامنے استادہ ہیں
بائیں جانب خوش جمال لکشمی سرتا پا پھولوں میں لدی نہایت آن بان سے کھڑی ہے۔
داہنی جانب سنجیدہ و بردبار سرسوتی ہے۔ جس کے سامنے کتابوں اور آلات موسیقی
کا انبار لگا ہوا ہے۔

وشنو کے آغوش میں ایک بھولی بھالی لڑکی ہے۔ جس کے جاہ و جلال کے
آگے بڑے بڑے خود سر جن سرنگوں نظر آتے ہیں: تمام دیوپریاں بلکہ خود دیوتا۔
اوسے تعظیم دے رہے ہیں۔ اوس کے چہرہ کی حسن رعنائی کو دیکھ کر خود "لکشمی"
اور "سرسوتی" بھی شرمائے جاتے ہیں۔

آہ یہ مادر ہند کا حقیقی مرقع ہے۔ جس نے مقدس دیوتاؤں کے آغوش
میں کھیل کر پرورش پائی۔ اور اقوام عالم میں ہمیشہ عزت و اقبال کا پھریرا
اڑاتی رہی۔

... دیوی "جگدھاتری" اپنے حیرت فزا بیش بہا جواہرات زیب جسم
... ہوئے جبال قامت ہاتھیوں کو، جو قوتِ صحرائی درندوں کو شکار
... آرہی ہے۔ اوس کا تخت جلوس خالص کنول کے پھولوں کا ہے۔
... ہے۔ دست میں سرشار، دست جوانی مستانہ ہی سے شوکت و
... آفتاب نصف النہار ... اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ
چمک رہا ہے۔

یہ مادر وطن کی تصویر ماضی ہے

... ہوا۔ اور کثیف تاریکی نے دنیا کے چاروں گوشوں کو
گھیر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دنیا کی ہر ہر شئی پر موت نے تسلط کر لیا ہے۔
... اس ہولناک اور دہشت انگیز تاریکی میں یکایک "کالی" دکھ الف کی دیوی
کا بھیانک چہرہ ظاہر ہوا۔ مگر اس حالت سے کہ آنکھیں جوش غضب سے نکلی پڑتی
ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ اور چہرہ پر ایک خوف اور وحشت طاری ہے۔
افلاس کے باعث جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہیں ہے۔ گلے میں مردوں کی کھوپریوں کا
ہار ہے۔ ہاتھ میں جذبۂ انتقام کا برہنہ خنجر۔!

آہ بھارت ورش (ہندوستان) کے وہ بے بس سپوت جو قحط کی
تکلیفیں اور ذلت کے صدمے نہ اٹھا سکے۔ اور قبل از وقت موت کے حوالے
ہو گئے۔

دیوی "کالی" کا چہرہ۔ جوش وغضب سے تمتما رہا تھا۔ محاسن اور نیکیوں
کا مجسمہ کس مپرسی کی حالت میں خاک پر پڑا ہے۔ آہ! جوشِ وحشت

یونیورسٹی انتخابات کی مصروفیت ووقت کی کمی کیوجہ سے مجلس ادارت نے یہ تصفیہ کرلیا ہے کہ میگزین کے دونوں نمبر (۳ و ۴) ایک ساتھ نکالدئے جائیں اسی لئے اب کی دفعہ رسالہ کا حجم بھی گذشتہ نمبروں کا تقریباً دوگنا ہے فقط

معتمد
مجلس ادارت

ڈاکٹر کیتھ باسول - مغربی افریقہ میں کیوں مقیم تھا - اس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں ہے ؟

اس کی حکمت روز افزوں ترقی پر تھی - اور اُس کی ذاتی آمدنی بھی وافر تھی - گو وہ کسی سے فیس نہ لیتا تھا - روزانہ اُس کے پاس میعادی بخار کے صدہا مریض چلے آتے تھے - اور وہ خندہ پیشانی سے اُن کا علاج کرتا تھا مغربی افریقہ اسی لحاظ سے نہیں بلکہ اور اعتبار سے بھی دلچسپ جگہ نہیں ہے - مگر باسول اس مقام سے کچھ اس قدر مانوس ہو گیا تھا - کہ وہاں سے ہٹنے کا نام بھی نہ لیتا تھا -

وہ نوجوان تھا اُس کی عمر تیس سال سے متجاوز نہ ہو گی - وہ انوکھی اور دلیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا - اور اکثر دیسیوں سے اختلاط پیدا کرتا کئی مرتبہ وہ دریائی سردار کے لباس میں دیکھا گیا ہے - اور بھتیرے دیسی دعوتوں میں اُس نے شرکت بھی کی - جن کو وہ کسی سے چھپانا بھی نہ چاہتا

تھا۔ اس ملک کی مختلف زبانوں سے وہ واقف تھا۔ اور دیسی اشیائے خورش کا بلا تامل و بغیر کسی کراہیت کے استعمال کرتا تھا

ڈاکٹر باسول کی بہت اچھی گذر رہی تھی۔ اور وہ سب میں بہ نہایت ہی محسن شخص تھا۔ جب کہ منیر اپنے بوڑھے باپ کے بعد تخت کا جانشین ہوا۔

کیتھ باسول اپنے بہترین دیسی لباس میں جاسا کو روانہ ہوا۔ جہاں پر منیر کی تخت نشینی کی خوشی میں تین دن تک جشن منایا جانے والا تھا۔ جشن کے پہلے دن شام کے وقت وہ ٹہلتے ٹہلتے گاؤں میں چلا گیا۔ اور سردار تارون کے جھونپڑے کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اور سورج کی بھی وداعی روشنی چھپروں کے چھت پر پڑ رہی تھی۔ اور مست وہ ہوشمند دیسیوں کے ڈھیر میں ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر کے رک جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔

تارون کے جھونپڑے کے دروازہ پر مغربی افریقہ کی حسین ترین لڑکی کھڑی تھی۔

ڈاکٹر باسول کو دیسی حسن پسند تھا۔ مگر اس پیکر لطافت کا حسن و نور کچھ اس بلا کا تھا کہ وہ بیتاب ہو گیا۔ تارون کی لڑکی کی شہرت حسن عام تھی۔ اس کی سرخ رنگت گلاب کو شرماتی تھی۔ اس کے گھونگھر والے بال ناگن کی طرح لہراتے تھے۔ اس کے نرم و نازک و تھرتھراتے لب و نکیلا بدن۔ اور دلبر باصورت عربی حسن کا نمونہ پیش کرتے تھے۔

ڈاکٹر ایک عالم فریفتگی و تحیر میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ کہ لڑکی کی سیاہ آنکھیں اٹھیں۔ اور اس سے دوچار ہوئیں۔ اس نے لرزتے ہوئے

چھوڑ دیتا ہوں۔ تو میرے سامنے سے اسی وقت چلا جا۔ تیری خیر اسی میں ہے اور تجھ نا ہنجار کو (بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر) عرب بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دونگا۔ کیونکہ تو بادشاہ کی زوجہ بن نہیں سکتی۔ تو لونڈی ہی رہے گی۔ دیکھ اس طرح سے ایک سردار "گوروں" کو ایسا مزا چکھا سکتا ہے۔

باسول نے جب دیکھا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے تو وہاں سے وہ فرط غم میں کس طرف چلا گیا خبر نہیں کہ کہاں۔

دوسرے دن بردہ فروشوں کا قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ اور یہ مشہور ہو گیا تھا۔ سردار قارون نے اپنی لڑکی کو ایک عرب کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

باسول کے ایک دوست نے اس عرب کو جاتے ہوئے دیکھا جس کے ساتھ "اجاسا" کی شہزادی تھی۔ عرب کی صورت سے متحیر ہو کر اس کی زبان سے "باسول" نکل گیا۔ عرب نے خاموشی کے لئے انگلی اٹھائی جس پر خاص انگریزی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

ترجمہ نظام الدین

مجلسِ مشاعرہ

بتقریب جوبلی۔کالج ہال مین بتاریخ ۱۹ ؍ نومبر مجلس مشاعرہ قرار پائی تھی۔ جس کے صدر عالیجناب نواب حیدر یار جنگ بہادر تھے ۔ ملک کے اکثر اہل قلم اصحاب نے شرکت فرماکر اپنے ذوق ادب کا ثبوت دیا۔ مشاعرے کی غزلیں ناظرین کی دلچسپی کے لئے شائع کی جاتی ہیں ۔ فقط

طرح :- جو آنکھ رکھتے ہیں وہ سب نظر نہیں رکھتے

نما جناب نواب ... جناب سید ... طباطبائی

فلک جو تیغِ حوادث کا ڈر نہیں رکھتے
تو اپنے دوش پہ ہم زیرِ سپر نہیں رکھتے

کسی کا عشق جو شمس و قمر نہیں رکھتے
تو آتشِ غم و داغ و جگر نہیں رکھتے

کماں کا جو شبِ غم میں جگر نہیں رکھتے
وہ ذوقِ جلوۂ حسنِ قمر نہیں رکھتے

نہ دو تسلیاں گے مرا ساتھ ہمرہانِ طریق
وہ یوں قدم دمِ شمشیر پر نہیں رکھتے

اڑا دیے اسے قد افگن گا کے تیر کوئی
ہوس ہے اڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے

لڑے جو اس سے ایسی نہیں آنکھ یہی
پڑے جو عیب یہ ایسی نظر نہیں رکھتے

سفینہ اپنا ہے صبر و رضا کے ساحل پر
امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے لامکان پر لیکن
فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

یہ راستی یہ تواضع جو سرو و بید میں ہے
شجر ہیں اور بھی ایسے ثمر نہیں رکھتے

عزیزِ خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ
سرِ غرور و دلِ کینہ ور نہیں رکھتے

فروغ دیتی ہے چشمِ محبتِ احباب
شعاعِ مہر ہے تارِ نظر نہیں رکھتے

خذف میں اور جواہر میں اب تمیز نہیں
نگاہ ہم نہیں رکھتے نظر نہیں رکھتے

انہیں کو ذرۂ اوجِ کمال تک ہے عروج
جو شوقِ نفع میں خوفِ ضرر نہیں رکھتے

وہ لوگ جو ہیں رہ مستقیم کے سالک | قدم ادھر نہیں رکھتے ادھر نہیں رکھتے

ستارہ تیری بزم طرب میں محو ہیں جو | نفس گدازیٔ یاد سحر نہیں رکھتے

دل فگار نگاہیں او نہیں چاک چاک جیب شکیب | لہ غم سے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

مریض غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک | کہ جیا وہ اگر تو امید سحر نہیں رکھتے

خرام ناز میں کیا جانے اب کیا گذری
قدم قدم کی خبر نامہ بر نہیں رکھتے

جناب محمد اصغر صاحب اصغر

عزیز حال کو اصل خبر نہیں رکھتے | جنون ہے جب حال دکھ نہیں رکھتے

قفس میں حسرت پرواز پر تڑپتے ہیں | جو قبلہ نما بال و پر نہیں رکھتے

مسافران عدم اشتیاق منزل میں | بجز کفن کوئی رخت سفر نہیں رکھتے

وفا وفا سے وفا کا کوئی تعلق بھی | کسی کے ساتھ نسبت فتنہ گر نہیں رکھتے

ہمارے نالے بھی کمبخت کوئی نالے ہیں | ڈرتے ہیں یہ اثر کو اثر نہیں رکھتے

عجب طرح کا پڑا انقلاب دنیا میں | بشر کے ساتھ محبت بشر نہیں رکھتے

وہی ہیں آپ کہ رکھتے خبر ہیں دنیا کی | اور ایک ہم ہیں کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

ازل کے روز سے ہم ہجر یار میں اصغر
شب فراق کی اپنے سحر نہیں رکھتے

نواب میر یوسف حسین خان تارن

ہمارے نالۂ دل کچھ اثر نہیں کرتے | وہ جان کر بھی ہماری خبر نہیں رکھتے

سید غلام پنجتن شمشاد بی۔ اے۔ ایل ایل بی

کہو کہو مرے نالے اثر نہیں رکھتے
کہاں ہیں آپ کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

جھکے جو غیر کے در پر وہ سر نہیں رکھتے
پڑے جو غیر پہ ایسی نظر نہیں رکھتے

پسِ فنا بھی وہ دو پھول مری تربت پر
نہیں کہ کہہ نہیں سکتے مگر نہیں رکھتے

ترے وہ ڈھونڈنے والے وہ جستجو والے
ترے کرم سے اب اپنی خبر نہیں رکھتے

دلِ حزیں کو او ہر صبر و ضبط کی تعلیم
اور یہ زعم کہ نالے اثر نہیں رکھتے

نگاہِ ناز کے زخموں کا یہ خزینہ ہے
تیغ کی تاب وہ اے چارہ گر نہیں رکھتے

وہ تم کہ ایک نہیں دس دلوں کے مالک ہو
وہ ہم کہ دل نہیں رکھتے جگر نہیں رکھتے

کلیم وادیٔ الفت وہ سخت منزل ہے
کہ جس میں خضر قدم بھول کر نہیں رکھتے

سزا جزا کا بھی اک روز آنے والا ہے
خیال اتنا بھی یارو بشر نہیں رکھتے

ہیں اپنے دورِ گذشتہ کے قصے گو شمشاد
زباں اگرچہ یہ دیوار و در نہیں رکھتے

نواب میر واحد حسین خان صاحب واجد

صلاحِ کار پہ ہم سا نظر نہیں رکھتے
وہ بے خبر ہیں کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

جو ہیں غلامی کے خوگر ہوں کس طرح آزاد
قفس ہے چھوڑ بھی دیجے تو پر نہیں رکھتے

ہیں سرفرازِ سلیمانِ دہر بھی لیکن
مثالِ بید یہ ظالم ثمر نہیں رکھتے

ہمیشہ رہتے ہیں مثلِ حباب خانہ بدوش
جہاں میں خانماں برباد گھر نہیں رکھتے

وہ ہم سے لیتے ہیں جو امتحان لن ترانی کی | انہیں گمان ہے تاب نظر نہیں رکھتے

ہم اپنی وضع کے پابند ہیں محبت میں | سرِ نیاز کسی پاؤں پر نہیں رکھتے

ہر ایک در پہ کریں کس طرح جبیں سائی | جھکا ہی لیتے ہیں کہ ہم لاکھ سر نہیں رکھتے

ہر ایک شے میں ہے مضمر ظہورِ یکتائی | سب آنکھ رکھتے ہیں لیکن نظر نہیں رکھتے

جنونِ جذبِ محبت ہے حضرت یوسف
وہ بے خبر ہیں کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

مرزا نظام شاہ صاحب لبیب تیموری دہلوی

سرِ نیاز کو ہم در بدر نہیں رکھتے | سوائے اپنے کسی پر نظر نہیں رکھتے

پرے ہے دونوں جہاں سے دماغ اہلِ نظر | یہ لوگ عرش پہ بھی مستقر نہیں رکھتے

چبھو گئی نگہِ ناز کی خدا جانے | ہم اپنے دل کی کچھ خبر نہیں رکھتے

ہزار آنکھ سے روتے ہیں خستگانِ دل | اگرچہ دیکھنے کو چشمِ تر نہیں رکھتے

ہمارے خون میں پنہاں ہے آتشِ محلول | یہ شعلے اٹھتے ہیں لیکن شرر نہیں رکھتے

مگر بغفلتِ دل ہے زبانِ عشق دراز | ہمارے نالۂ شب گیر اثر نہیں رکھتے

چلے ہی جاتے ہیں سب رہروانِ راہِ عدم | نگاہ کام کرے کیا مگر نہیں رکھتے

حریمِ راز میں سب ہیں مگر تنِ تنہا | سوائے اپنے کسی کی خبر نہیں رکھتے

رہے ہی جاتے ہیں عمرِ عزیز پا کے ہم | حباب کو زندگی مختصر نہیں رکھتے

دلوں میں گونج رہی ہے صدائے عشق لبیب
رواں ہیں وہ بھی جو قصدِ سفر نہیں رکھتے

مثال بو ہمیں آوارگی پسند نہیں
ہوائے دوش نسیم سحر نہیں رکھتے

فراغ طول شب غم نے ایسا بخشا ہے
کہ شام سے ہی امید سحر نہیں رکھتے

انہیں ہے رشک کچھ اسدرجہ عکس سے اپنے
کہ آئینے کو بھی پیش نظر نہیں رکھتے

تصور سر مژگاں کشیدہ ہے جب سے
ہم تراوش زخم جگر نہیں رکھتے

عجب دماغ ہے ان بوریا نشینوں کا
یہ پاؤں بھول کر بھی تخت پہ نہیں رکھتے

فریب خوردۂ حسن ازل ہیں ہم شاکر
سوائے بیخبری کچھ خبر نہیں رکھتے

مریض عشق کی خود تم خبر نہیں رکھتے
کہ فکر چارہ گری چارہ گر نہیں رکھتے
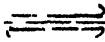
وہ اپنے دل کو تجلی اثر نہیں رکھتے
جگر میں اپنے جو داغ جگر نہیں رکھتے

شب فراق نہ وحشت فزا ہوں پھر کیونکر
کہ نالے پردۂ ساز اثر نہیں رکھتے

برائے حسن دہر میں بشکل دیدۂ نرگس
ہم آنکھ رکھتے ہیں لیکن نظر نہیں رکھتے

وہ تو کہ روز مسرت کی شب نہیں رکھتا
یہ ہم کہ شام الم کی سحر نہیں رکھتے

عدم کو جاتے ہیں دار فنا سے خالی ہاتھ
سفر کا قصد ہے زاد سفر نہیں رکھتے

جگر جو دیتے شب غم ترے تصور کو
ہم اسطرح کا تو تار نظر نہیں رکھتے

نگاہ بینا سو وہ انکی نگاہ باطن ہے
نظر دکھاوے کی اہل نظر نہیں رکھتے

نہ کسلئے مری نظروں میں دونوں یکساں ہوں
کہ ذوق رنج و الم بال بھر نہیں رکھتے

کسی کے آتے ہی اڑتے ہیں کسطرح آخر
اگر یہ ہوش مرے بال و پر نہیں رکھتے

غریب جائے جہاں میں لگے کسطرح بستر
کہ اسکے کوچہ میں تاب گذر نہیں رکھتے

ہمارے نالۂ دل کیا اثر نہیں رکھتے
خدا کا شکر ہے ہم نامہ بر نہیں رکھتے

ترے جو بھول   نہیں رکھتے
مٹایا خدا نے بڑ ہے جب کمر نہیں رکھتے

کہا کسی نے کہ کیوں   نہیں رکھتے
کہا جواب میں بندے تکبر نہیں رکھتے

وہ ہر یہ وہ ہر میں مادر پدر نہیں رکھتے
وہ شہر میں ہیں اپنا گذر نہیں رکھتے

بڑوں کی بات کا ہم کیوں اثر نہیں رکھتے
مگر رکے میں ازل سے قدر نہیں رکھتے

ہم ان سے کیا ملیں اپنی خبر نہیں رکھتے
کلیم طور پہ اپنی نظر نہیں رکھتے

یہ واقعہ ہے کہ ہم مال و زر نہیں رکھتے
ہماری عقل و سمجھ جانور نہیں رکھتے

جو رستان رکھتے ہیں وہ در پہ سر نہیں رکھتے
وہ باپ جب کے ہیں اپنا پدر نہیں رکھتے

وہ بھول کر بھی عدو کی خبر نہیں رکھتے
ملیگا راہ میں اختر خدر نہیں رکھتے

میر وزارت علیخان صاحب متعلم بی۔ اے نظام کالج حیدرآباد

جو اپنے سینے میں بودا اثر نہیں رکھتے
ستم ظریفی عالم کا ڈر نہیں رکھتے

یہ حال آج ہے اغیار کی ترقی کا
کہ وہ زوال کا دلمیں خطر نہیں رکھتے

وہ   دیکھئے۔ اڑتے ہیں آسمانوں میں
اگرچہ دیکھنے کو بال و پر نہیں رکھتے

اڑے ہوا میں سمندر میں ڈوبکر نکلے
وہ اپنے ہاتھ میں کیا کیا اثر نہیں رکھتے

سنگین گن سے زمانہ کے دلکو توڑتے ہیں
ہماری طرح وہ تیر و تبر نہیں رکھتے

ہوئی ہے قابل رشک انکی باغبانی بھی
چمن میں کوئی شجر بے ثمر نہیں رکھتے

نظر میں انکی ہے سب کچھ مگر ہمیں کچھ
رفیق کوئی بجز چشم تر نہیں رکھتے

ہمارے سینے میں وہ جوش اب نہیں باقی
ہم اپنے پہلو میں اب وہ جگر نہیں رکھتے

یں کو دیکھ کے حور و نپہ ہے ناز اہد ❊ جو آنکھ رکھتے ہیں سب وہ نظر نہیں رکھتے

علیم جائے پیام اپنا کسطرح سے کہ ہم
سوائے صبا کے کوئی نامہ بر نہیں رکھتے

دیگر مصرع طرح

سر بلندوں سے انکسار نہ ہو

جناب محمد اصغر صاحب بیرسٹر

چشم خونبار اشک بار نہ ہو ❊ آپ اپنی نظر میں خوار نہ ہو

جز غم یار کوئی یار نہ ہو ❊ دوسرا اور غمگسار نہ ہو

کچھ ٹھکانا ہے اس تغافل کا ❊ مر بھی جاؤں تو اعتبار نہ ہو

کوئی وہ آنکھ ہے نشیلی آنکھ ❊ جسمیں مستی نہ ہو خمار نہ ہو

آتے آتے قرار آئیگا ❊ دل بیتاب بیقرار نہ ہو

اسقدر مست تو پلا ساقی ❊ ہوش آئے تو ہوشیار نہ ہو

جب مزا ہے کہ تیر قاتل کا ❊ دل میں رہجائے دلکے پار نہ ہو

مست نکلے شراب خانہ سے ❊ اثر ابر نو بہار نہ ہو

نگہ واپسیں یہ کہتی ہے ❊ محو ہو محو انتظار نہ ہو

غیر ممکن ہے خلد میں اصغر
جسے کوثر ہو بادہ خوار نہ ہو

سید غلام بخش صاحب شمشاد بی اے ایل ایل بی

دل مہجور داغدار نہ ہو — یہ چمن اور صدا بہار نہ ہو

قول ناصح کا سر پہ آنکھوں پر — اور جب دل پہ اختیار نہ ہو

پھر بھی سنتا ہوں کہ آتے ہیں — کم مرا کیف انتظار نہ ہو

شیخ کو بھی حلال ہے وہ شراب — جسمیں تلخی نہ ہو خمار نہ ہو

برق کو صورت قرار کہاں — دل مرا اور بے قرار نہ ہو

کہکشاں جسکو لوگ کہتے ہیں — کہیں اونکے گلے کا ہار نہ ہو

دوستی میں بھی جان لیتے ہیں — بھول کر کوئی انکا یار نہ ہو

کہیں ناکامیوں کے ہاتھوں پھر — دامن صبر تار تار نہ ہو

ٹھوکروں سے مٹا رہے ہو جسے — دل مرحوم کا مزار نہ ہو

اہل دل دل اوسی کو کہتے ہیں — جسمیں کینہ نہ ہو غبار نہ ہو

دلے شمشاد یہ کھٹک نہ مٹے
پار تیر نگاہ یار نہ ہوئے

محمد عبد الرحیم صاحب رحیم منشی فاضل

دل وہ کیا دل جو بے قرار نہ ہو — آنکھ کیا وہ جو اشکبار نہ ہو

مجھسے برگشتہ میرا یار نہ ہو — نہ ہو۔ اسطرح زینہار نہ ہو

قصۂ حال زار کس سے کہیں — یار جب اپنا غمگسار نہ ہو

میں نے مانگی دعا ہو وصل نصیب — ہنسکے بولے وہ زینہار نہ ہو

لیکے دل اُسنے راہ لی اپنی | چور چوری کرے فرار نہ ہو
ہم کبھی اُف زبان سے نہ کریں | دلیس کاوش جو باربار نہ ہو
لطفِ نظارۂ چمن معلوم | سینہ گر اپنا داغدار نہ ہو
اک نہ اک روز ہو ہی جائیگا وصال | زندگی کاش مستعار نہ ہو

ہیں مضامیں جو دلفریب حلیمؔ
کیوں غزل میری سب سے پیار نہ ہو

تیغِ ابرو کا دلپہ وار نہ ہو | اسطرح کوئی دلفگار نہ ہو
رنج رُدشن جو آشکار نہ ہو | سحر شام انتظار نہ ہو
قلب میرا جو اعدار نہ ہو | تو یہ صد رشکِ لالہ زار نہ ہو
میں نہ مضطر ہوں جب شب وقت | بیقراری میں کیوں قرار نہ ہو
نخلِ غم کسطرح پھلے پھولے | دیدۂ تر جو آبیار نہ ہو
تو نہ تڑپا ہے اگر مجھے ظالم | دل بھی پہلو میں بیقرار نہ ہو
جادۂ زیست کر رہا ہے جو طے | توسنِ عمر کا سوار نہ ہو
سروِ گلشن میں آج بر ہم ہیں | کہیں قمری کو حکمِ دار نہ ہو
جب شبِ وعدہ تو نہیں آئی | کسطرح تیرا انتظار نہ ہو
دیکھے گیسو کی جب پریشانی | نثر لفظا انتشار نہ ہو
کیا اثر ہو ہمارے رونے کا | دیدۂ دل جو اشکبار نہ ہو
چین پائے پس فنا عاشق | ٹھوکروں میں اگر مزار نہ ہو
روز گجرے جو لاکے دیتا ہے | کہیں دشمن گلے کا ہار نہ ہو
جسکو کہتے ہیں فتنۂ محشر | کہیں وہ بھی خرام یار نہ ہو

بے سبب مضطرب نہیں اللہ — کوئی سرمزار نہ ہو
نہ چلے تیرے کوچہ میں تلوار — گرم میدان کارزار نہ ہو
حوصلہ پھر جنوں کا کیا نکلے — دامن دل جو تار تار نہ ہو
نکلے اقلیم دل سے وہ نہ کہیں — کہیں ویراں یہ دیار نہ ہو
یاد تیری تو ہجر میں ہے انیس — نہو کوئی جو غمگسار نہ ہو
کیا نہ لپٹے وہ تیرے دامن سے — اوج پہ کیوں غبار اغیار نہ ہو

صید جیسا ہوا ہوں میں ساقی
یوں الم کا کوئی شکار نہ ہو

حکیم فقیر احمد صاحب فقیر (عمدۃ الحکماء) تلمیذ حضرت سید ظہیر الدین حسن ظہیر دہلوی یادگار خان دبیر

مائل آہ قلب زار نہ ہو — راز سربستہ آشکار نہ ہو
موسم گل ہوا ور یار نہ ہو — یہ تو اے میرے کردگار نہ ہو
ضبط کی لاج ہے جو عاشق کو — چار کے آگے اشکبار نہ ہو
آہی جائینگے وہ دل مضطر — صبر کر صبر بیقرار نہ ہو
اسکا کیا حشر ہو خدا جانے — جو گنہ کر کے شرمسار نہ ہو
چوکڑی بھر رہا ہے دل اپنا — یہ ہرن وہ ہے جو شکار نہ ہو
رکھے ہر آدمی خدا سے امید — وہ ہے کا امیدوار نہ ہو
کیا اٹھائے وہ لطف وعدہ کے — جسکو تکلیف انتظار نہ ہو
وہ نظر کیا جو تیر بن کے بھی — جگر و دل کے آر پار نہ ہو
یا گنہ میرے بخشدے یارب — یا گنہ کا مرے شمار نہ ہو

کام وہ کیجے زمانے میں | جو کسی کو بھی ناگوار نہ ہو
آدمی وہ نہیں جو ہو بے فیض | وہ شجر کیا جو سایہ دار نہ ہو

زہی میں اگر فقیر نہیں +
پھر وہ کیا ہے جو مالدار نہ ہو

سید مسعود احمد صاحب رضوی

دل وہ کیا ہے جو داغدار نہ ہو! | آنکھ وہ کیا جو اشکبار نہ ہو
کیوں وہ گل رو ستم شعار نہ ہو | کیا یہ ممکن ہے گل ہو خار نہ ہو
قصۂ درد سن تو لے ظالم | میرا ونتہ جو بے قرار نہ ہو
زندگی اسکی ہے پریشاں خواب | جسکو سودائے زلف یار نہ ہو
حسرت و غم میں لطف ہے یارب | کاش دل میرا کامگار نہ ہو
مرکے ہم چاہتے ہیں گمنامی | کوئی کتبہ سر مزار نہ ہو
دل نادان نوجوان ہے ابھی | تیر غم کا کہیں شکار نہ ہو
شاذ ہیں ایسے لوگ دنیا میں | موت سے جنکو انتشار نہ ہو
خاک سے ہے سرشت آدم کی | آدمی کیا جو خاکسار نہ ہو
ملئے اسطرح سے کہ سب خوش ہوں | بات کیجے تو ناگوار نہ ہو
قصۂ غم سنائے کس کو | جب کوئی اپنا غمگسار نہ ہو
جام پر جام بھر کے دے ساقی | رائگاں موسم بہار نہ ہو

غیر ممکن ہے تجھ پہ جان جہاں
رضوی خستہ جاں نثار نہ ہو

ساتھ ہی انہوں نے طلباء کو اس بات کی توجہ دلائی کہ وہ اپنا قومی لباس پہنا کریں۔ اہل یورپ جیسے وہ اپنی قومیت کا لحاظ رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ویسے ہی دوسری اقوام بھی اپنی قومیت برقرار رکھیں اور یورپ کی تہذیب سے متاثر اتنی نہ ہوں کہ اپنی اصلیت کھو بیٹھیں جو لوگ غیر اقوام کے چال چلن تہذیب و شائستگی اتنی اختیار کر لیں کہ خود اپنے اطوار و شائستگی کو بھول جائیں تو وہ در اصل اپنی شخصیت غیر قوم میں کرتے ہیں رپورٹ کے بعد انعامات تقسیم کئے گئے۔ شام میں انجمن کا مباحثہ تھا جس میں سگرٹ کی بھلائیوں و برائیوں پر بحث کی گئی۔ دونوں پہلوؤں پر تفصیلی نظر ڈالی گئی لیکن جن اصحاب نے سگرٹ کے خوبیوں پر زور دیا انہوں نے اپنی قوت تقریر سے حاضرین کو ایسا متاثر کیا کہ حاضرین کو متفقہ طور پر یہ منظور کرنا پڑا کہ سگریٹ پینا اچھا ہے۔ رات میں انجمن کی جانب سے شکسپیر و دیگر مقامات کے چند سین اسٹیج پر دکھائے گئے بعض اصحاب نے اپنا پارٹ نہایت ہی خوبی سے ادا کیا۔ مسٹر مارلیس پروفیسر کرشنا مورتی و مسٹر قدیم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں :۔

دوسرے دن اسپورٹس ہوئی جکا ذکر ہم نے کھیل کے عنوان میں کیا ہے۔ رات میں مشاعرہ تھا جسمیں ملک کے اکثر اہل سخن حضرات نے شرکت فرمائی تھی۔ مشاعرے کے چند انتخابات میگزین میں درج کئے جا چکے ہیں۔

جوبلی ختم ہوئی کالج کی خشک زندگی میں اسکی چہل پہل نہایت ہی مسرت انگیز تھی۔ فقط ا۔

شکر ہے اس سال کالج والوں نے کھیلوں میں نمایاں ترقی کا اظہار کیا ہے
خاص طور پر کرکٹ میں تو ہماری ٹیم نے خاصی مہارت حاصل کرلی ہے۔ یہ کپتان
صاحب کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ اس سال انہوں نے یہاں کی مختلف ٹیموں سے
مقابلہ' matches ' مقرر کرکے اپنی ٹیم کی خوب مشق کرالی۔ چنانچہ اس سال
انٹر کالج ٹورنمنٹ میں کامیابی کالج ہی کے ہاتھ رہی۔ اور مدت دراز کے بعد کوئی
نو سال کے عرصے کے بعد) طلباء قدیم کے خلاف کالج ہی کی ٹیم نے فتح پائی۔ سید
نقی صاحب بلگرامی اور امیش چندر صاحب کالج کے بہترین کھلاڑی کہلائے جانے کے
مستحق ہوسکتے ہیں۔

مدرسہ عالیہ نے بھی کرکٹ میں خوب حصہ لیا۔ انٹر اسکولس میں کامیابی کا
سہرا اسی کے سر رہا۔

یہاں ہم معراج علی صاحب کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا
کھیل خصوصاً مقابلہ کے دن یہ ظاہر کرتا تھا کہ آئندہ وہ ملک کے بہترین کھلاڑی
بن سکتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ صرف ان اکیلے کی بدولت مدرسہ جیت گیا۔

دونوں مرتبہ بغیر اوٹ (   ) ہوئے سو سو سے اوپر دوڑ بنائے ۔ دوسری مرتبہ تو شاید دو سو سے اونچے بن جاتے اگر کوئی ان کا ساتھ دیتا ۔ گیند اندازی (بولنگ) میں ان کے بھائی ممتاز علی صاحب کا نمبر سب سے بڑھا رہا ۔

(فُٹ بال)

دن بدن کالج والوں نے فٹ بال میں دلچسپی لینی کم کر دی ہے ۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نظام کالج فٹ بال ٹیم کی پہلی شہرت سب جاتی رہی ۔ اس سال کالج کی ٹیم انٹر کالج ٹورنمنٹ میں ابتدائی مقابلے میں ناکام رہی کھیل سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کھلاڑیوں نے بہت کم مشق کی ہے ۔ ہم کپتان صاحب کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اپنی کوششوں سے لڑکوں کو کھیل میں دلچسپی لینے کیطرف متوجہ کریں گے ۔

(ہاکی)

ہاکی کا تو ابھی آغاز ہوا ہے ۔ ٹیم خاصی زبردست معلوم ہوتی ہے ۔ اگر کھیل برابر جاری رہے تو بہت ممکن ہے اس سال ٹورنمنٹ جیت لے ۔ لیکن کھیل میں سرگرمی جیسی ہونی چاہئے ۔ ویسی ظاہر نہیں ہوتی ۔ رفتار کچھ سست سی معلوم ہوتی ہے ۔ کالج کے کھلاڑیوں کو کیا گذشتہ سال کا سبق کافی نہیں ۔ ؟ وہ ٹیم جسے توی امید ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ جیت جائیگی کیسے ناکام رہی ۔ اچھے دبرے کھلاڑیوں پر جیتنے ہارنے کا دارومدار نہیں مشق بڑی چیز ہے ۔

(ٹینس)

آجکل ٹینس بھی گیند بلے کی طرح دلچسپی کا مرکز بن گیا ہے۔ نیا فرش تیار ہونے پر لڑکوں کے دلوں میں اور بھی شوق پیدا ہوا۔ بہتر ہوتا کہ دوسرے کورٹ کی بھی کم از کم مرمت کر لی جاتی۔ تاکہ جنہیں پہلے فرش پر کھیلنے کا موقع نہ ملے دوسرے پر کھیل سکیں۔

کھیل

جوبلی کے موقع پر مختلف کھیل ہوئے تھے۔ کا۔۔۔وں ز ...) اور تمغوں کا شاندار نظارہ لڑکوں کے دلوں میں جوش پیدا کر رہا تھا۔ اکثر لڑکے اس میں شریک ہوئے اور انعامات حاصل کیے۔

کھیلوں کے ضمن میں ہم پرنسپل صاحب۔ و پروفیسر ڈیورنڈ (...) کے مشکور ہیں۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کالج والوں نے کھیلوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ ورنہ انہیں سوائے کتابوں کے کیڑے بنے رہنے کے کوئی اور شغلہ نہ تھا۔

اس سال پروفیسر ڈیورنڈ صاحب نے جسمانی جماعت کی تعلیم کھولی ہے۔ مختلف ورزشی سامان کالج ہال میں جمع کر لیا گیا ہے۔ تاکہ جنہیں اپنی جسمانی حالت درست کرنی ہو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ فقط

ایڈیٹر

ختم